National Council for Promotion of Urdu Language
www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

مارچ 2023

عالمی یوم خواتین مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

دلچسپ کہانیاں

سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین

صحتِ اطفال

بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

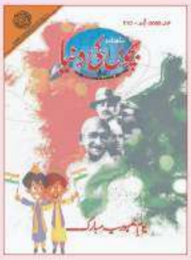

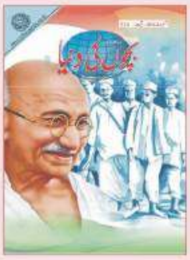

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِ تعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ
خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 7 شمارہ: 3 مارچ 2023

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل	مدیر	4

شخصیت

ساجدہ زیدی کی غزل گوئی	صائمہ ثمرین	5

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار		8

جہان نسواں

تعلیم نسواں اور حکومت کی پالیسیاں	ڈاکٹر محسنہ انجم اے انصاری	9
شین مظفر پوری کے فکشن کے نسوانی کردار	صوفیہ شیریں	14
اسلم مرزا کی منصفانہ تحقیق و تالیف	خواجہ کوثر حیات	20
صفی اورنگ آبادی	ڈاکٹر شاہین فاطمہ	23
موتی لال ساقی شخصیت اور فن	ڈاکٹر اسماء بدر	26
رشید حسن خاں اور ظفر احمد صدیقی کی ادبی خدمات	رفعت اختر	29
ناول 'فردوس بریں' اور شیخ وجودی	ساجدہ خاتون	35
ساحر لدھیانوی کی نظموں میں عورت کا کردار	ثنا اسد	38

اعتراف ہنر

ڈاکٹر ساجدہ قریشی کی فرہنگ باغ و بہار کا مختصر جائزہ	شہپر شریف	40

حسن سخن

عرش منیر، ریشما زیدی، خوشبو پروین		44

افسانہ

دوسرا بابل	شہانہ اقبال	46
قطع	کوثر سید یوسف	50
بے وفا	شمیمہ صدیق شمی	57

صحت

حمی نفاسیہ	ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی	60

قارئین کے خطوط

مراسلہ		62

مشعل

قارئین خواتین دنیا کو عالمی یوم خواتین کی پرخلوص مبارکباد!

8 مارچ کو ہر سال عالمی سطح پر یوم خواتین منایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ خواتین کے تعلق سے جو مسائل ہیں ان پر غور وفکر کیا جائے اور ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے اور خواتین کو بیدار کیا جائے۔ مختلف برسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے اور اس کے بہت مثبت اثرات بھی سامنے آئے ہیں۔ عورتوں نے خود بھی اپنے بنیادی مسائل کے تعلق سے سوچنا شروع کیا اور خواتین کی بڑی تعداد کو اپنے مسائل اور حقوق سے آگاہ بھی کیا۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے تعلق سے کچھ تحریکیں شروع ہوئیں، کچھ ادارے قائم ہوئے جنھوں نے عورتوں کی شناخت اور ان کے حقوق کے تعلق سے عمومی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں تانیثی تحریکوں کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان تحریکوں کے بھی کچھ مثبت اثرات نسائی شعور پر پڑے اور خواتین نے ان تحریکوں سے تحریک پاکر اپنے مسائل بیان کرنے شروع کیے۔ دراصل عورتوں کی آزادی، مساوات اور اس سے جڑے ہوئے بہت سے مسائل ہیں جن پر غور وفکر کرنا معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ عورتوں کے ساتھ بہت سی سطحوں پر مسائل جڑے ہوئے ہیں۔ تعلیمی پسماندگی، صنفی عدم مساوات، معاشی کمزوری بنیادی مسائل ہیں۔ آج جبکہ عورتوں کے امپاورنمنٹ پر زیادہ زور دیا جارہا ہے تو ایسے میں عورتوں کی حالت میں قدرے تبدیلی آئی ہے اور پہلے کے مقابلے میں زندگی کے ہر شعبے میں عورتیں اپنی کامیابی کا پرچم لہرا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں عوتوں کے تعلق سے جو ادب لکھا جارہا ہے خاص طور پر شاعری اور افسانے میں عورتیں اپنے جذبات اور احساسات کا کھل کر اظہار کررہی ہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ بہت سے مرد حضرات بھی عورتوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کررہے ہیں اور ان کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

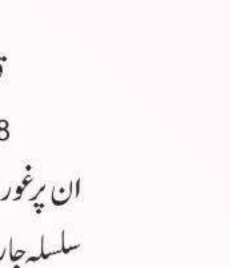

اکیسویں صدی میں تعلیمی اور سماجی سطح پر خواتین میں بیداری آئی ہے مگر بہت سے چیلنجز کا بھی سامنا ہے۔ امید ہے کہ خواتین جس طرح سے متحرک ہوئی ہیں یہ چیلنجز بھی رفتہ رفتہ ختم ہوجائیں گے۔ خواتین کے لیے بہت سے رسائل اور مجلّات شائع ہوتے ہیں جن میں خواتین آج کے مسائل کے حوالے سے گفتگو کرتی ہیں۔ گفتگو کا دائرہ اب وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اس لیے یہ امکان ہے کہ پہلے کی طرح خواتین جبر اور استحصال کا شکار نہیں ہوں گی بلکہ اپنے ماضی سے سبق حاصل کرکے مستقبل کو روشن کرنے کی کوشش کریں گی۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

صائمہ ثمرین

ساجدہ زیدی کی غزل گوئی

ساجدہ زیدی جدیدت کے عہد کی شاعرہ رہی ہیں اور جدیدت اردو ادب میں ایک بے حد اثر انگیز رجحان رہا ہے جس نے ادب کی متعدد اصناف پر اپنے اثرات ڈالے۔ ان اثر پذیر اصناف میں غزل سر فہرست ہے۔ برصغیر میں آزادی کے بعد غزل کی جو نئی فضا قائم ہوئی اس میں ایک تو جدیدیت کے زیر اثر غزل کی کلاسیکی روایت کا احیا ہوا اور ترکیب شعر کے کلاسیکی طریقوں کو اپنا کر لوگوں نے شعر کہنے شروع کیے۔ اس رویے نے غزل کی روایت کو نہ صرف مضبوط کیا بلکہ اس میں بہت سے اوصاف یکجا کیے جو یا تو کم ہو گئے تھے یا معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ مضمون آفرینی اور کثرت معنی وغیرہ کی صورتیں سامنے آئیں۔ اسی رویے کے ساتھ ایک تانیثی رویہ بھی غزل میں پیدا ہوا۔ تانیثی تصور کے زیر اثر شاعری کرنے والی خواتین غزل گو شاعرات میں دو قسم کی شاعرات سامنے آئیں۔ ایک وہ تھیں جنھیں تانیثیت اور تانیثی مسائل زیادہ عزیز تھے۔ اس لیے انھوں نے اسے ہی بنیادی اہمیت دی اور پدر اساس سماج میں عورت کے مسائل کو بیش از بیش پیش کیا۔ دوسری قسم ان شاعرات کی ہے جنھوں نے اپنے صنفی وجود کا اثبات غزل میں کیا لیکن ساتھ میں کلاسیکی حسن کو بھی نبھانے اور اپنی غزل گوئی میں اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ ساجدہ زیدی اسی آخر الذکر قسم کی نمائندگی کرتی ہیں۔

کے یہاں محبوب اپنا کردار تبدیل نہیں کرتا، عاشق کی طرف سے اپنے محبوب کے تئیں جو تڑپ اور لگن ہوتی ہے اس کی آنچ ساجدہ زیدی کے یہاں محسوس کی جاسکتی ہے۔ صبا، گل، خیال اور خاک جیسے الفاظ جس طرح کلاسیکی غزل میں مخصوص فضا اور کیفیت پیدا کرتے ہیں وہ ساجدہ زیدی کے یہاں بروئے کار آتے ہیں۔ وہ بحیثیت اضطراب درد کا اثبات کرتی ہیں، وہ لذت آشنائی سے انکار کرتی ہیں اور اپنی خاک میں پوشیدہ اضطراب کا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ محبوب کے خیال و ذہن میں ہر لحظہ قیام کو جی کی تازگی اور طبیعت کے نشاط کا باعث بتاتی ہیں:

صبا میں مست خرامی گلوں میں بو نہ رہے
ترا خیال اگر دل کے روبرو نہ رہے

ہے جستجو میں تری اک جہاں کا درد و نشاط
تو کیا عجب کہ کوئی اور جستجو نہ رہے

نہیں قرار کی لذت سے آشنا یہ وجود
وہ خاک میری نہیں ہے جو کو بکو نہ رہے

ساجدہ زیدی کے یہاں درد اور غم کو جشن کی صورت انگیز کرنے اور

آتی ہے۔ان کی یہ ساری فضا کلاسیکی غزل کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔وہ کلاسیک کے سرچشمے سے اپنے فن کو سیراب کر کے توانا اور زود اثر بناتی ہیں:

رات گہری ہے تو پھر غم بھی فراواں ہوں گے
کتنے بجھتے ہوئے تارے سر مژگاں ہوں گے

شہر ہو دشت ہو محفل ہو کہ ویرانہ ہو
ہم جہاں جائیں وہیں خار مغیلاں ہوں گے

دید کا بار امانت نہ اٹھے گا اس شب
خونچکاں صبح تلک دیدۂ حیراں ہوں گے

ساجدہ زیدی ایک شخصی احساس کو پیکر سے متعلق کر کے اس کی تاثیر اور ہمہ گیری کو دکھانے پر قدرت رکھتی ہیں۔وہ انسانی نفسیات کا بھی درک رکھتی ہیں اور یہ جانتی ہیں کہ درد و غم کی کیفیتیں شروع ہی سے صاحب دل انسانوں کا حصہ رہے ہیں۔دنیا کے اس نگار خانہ میں چیزیں یا مادی مظاہر زیادہ نہیں بدلتے ، بلکہ انسانی کیفیت انھیں مظاہر کو نئے نئے پیکروں میں دیکھتی ہے:

دشت پیمائی میں بھی وحشت جاں اتنی نہ تھی
تشنگی ساحل دریا پہ حراساں کیوں ہے

وہی ہے جادہ وہی سفر ہے وہی ہے منظر وہی نظر ہے
مگر یہ انداز آشنائی ہماری وارفتگی نئی ہے

زوال ہستی کے نوحہ خواں تھے کوئی ہماری زباں نہ سمجھا
بجھے ہیں سینوں میں دل سبھی کے کہ اپنی آشفتگی نئی ہے

ساجدہ زیدی کی غزل میں جو یہ حسن پیدا ہوا تو کیسے پیدا ہوا، اور اس میں جانی پہچانی مانوس سی تاثیر کا سرچشمہ کیا ہے؟اس سوال کا جواب دو طرح دیا جا سکتا ہے۔ایک فن کے زاویہ سے دوسرے تصور ذات اور کائنات کے زاویے سے۔ساجدہ زیدی نے یہ کیا کہ وہ کسی ازم اور کسی سماجی نعرے کے پھیر میں نہیں پڑیں بلکہ انھوں نے اپنی روایت پر نظر رکھی اور وہاں جو اظہار کے مضبوط ذرائع تھے اور شعر بنانے کے جو اہم وسائل تھے ان وسائل کو اختیار کیا، اور اس طرح مضمون کی ایسی صورتیں انھیں ہاتھ آئیں جو کسی بیرونی نظریے اور خارجی دانشوری سے ملوث نہیں تھیں۔اسی لیے وہ ذات کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب رہیں۔زندگی اور ادب دونوں میں نشاط و الم اہم رہے ہیں ،لیکن الم ہمیشہ زیادہ بامعنی اور زندگی کا زیادہ ہمہ گیر تجربہ دینے والا وسیلہ رہا ہے۔ساجدہ زیدی کا تعلق چونکہ زندگی کے تلخ حقائق سے ہے اس لیے انھوں نے اس راز کو نہ صرف پا لیا بلکہ آتش زیر پا میں انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ذات و کائنات کے نشاط و غم میں بہت زیادہ بعد نہیں۔وہ ذاتی المیہ کو انسانی تقدیر کے المیہ سے الگ کر کے نہیں دیکھتی ہیں۔ہجر و وصال کے نشاط و الم اور زندگی کے دوسرے نشاط و الم میں کوئی کیفیاتی بعد نہیں رہتا۔

دل سلامت ہے تو دل کے لیے آلام بہت
اس زیاں خانے میں اک جان کا زیاں کچھ بھی نہیں

ساجدہ زیدی کے اس شعر سے غالب کے اس شعر کی طرف ذہن جاتا ہے کہ:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ساجدہ زیدی نے دل اور جان کی اہمیت کو زیادہ اجاگر کرتے ہوئے جان کی حیثیت اور دل کے مقام کو متعین کیا ہے۔ساجدہ زیدی کی اس فلسفیانہ فکر کی بنت میں درد کا شعر پشت پناہی کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ:

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ کہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

غزل کے بدلتے رجحانات اور غزلیہ روایت کی جدید غزلیہ عہد میں کارفرمائی دیکھنا مقصود ہو تو ساجدہ زیدی اور غالب کے مندرج اشعار کا بغور مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔غالب کا شعر غزلیہ کلاسیکی روایت اور تصور شعر سے وابستگی کی واضح دلیل ہے، جہاں شب غم بھی عاشق کی ہی تصور کی جاتی ہے اور مرنے یعنی عشق میں معشوق پر جان دینے کا تصور بھی عاشق سے ہی وابستہ ہے۔یہاں عشق کی واردات کو زیادہ پختہ اور اثر انگیز بنانے کے لیے جان کی قیمت کو ادنی حیثیت میں لایا گیا ہے، تاکہ شب غم کی شدت کو واشگاف کیا جا سکے۔غرض غالب کا شعر غزل کی تصوراتی دنیا سے وابستہ ہے۔

ساجدہ زیدی کا شعر ، غالب کے شعر کی یاد ضرور دلاتا ہے لیکن ، یہاں غزل کی دنیا کا کردار یعنی عاشق کا کردار اس صورت میں نہیں لایا گیا جیسا کہ کلاسیکی غزلوں کا خاصہ مانا جاتا ہے۔

غالب کے شعر میں '' شب غم ''اور ساجدہ زیدی کے شعر میں ''زیاں خانے'' کی ترکیب نے ان دونوں اشعار کو دوالگ الگ منطقوں کا بنا دیا ہے۔شب غم سے عموماً ہجر کی شب ہی مراد لی جاتی ہے، زیاں خانے سے دنیا مراد لی جاتی ہے۔ جب کہ دنیا کو قید خانہ، بیڑی وغیرہ کہنے کا تصور بھی پرانا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ساجدہ زیدی کے شعر میں عاشق کے مخصوص کردار کے بجائے ایک عام انسانی کردار ہے۔ یہاں دل کی حساسیت عام ہے۔ یہاں کردار عاشق نہیں، یہاں کردار دل ہے جس طرح درد کے شعر میں دل کے جینے کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی دل ہی زندگی ہے اس کے پیچھے عشق کا بھی فلسفہ ہوسکتا ہے جوش وجنون، پیشین کا فلسفہ بھی، جینے کی چاہ کا بھی، مقصد ومنزل کا بھی، اور مقصد زندگی کا بھی، دل کی زندگی انھیں چراغوں میں سے کسی چراغ کے روشن رہنے سے ہی عبارت ہوسکتی ہے۔ چراغ گل اور زندگی ختم۔اس زندگی کا خاتمہ موت کو بھی بے حقیقت کر دیتا ہے۔ جاں سے گزر جانا، مرجانا، گو کہ اہم ہے لیکن دل کی موت اس سے کہیں بڑا سانحہ ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ کلاسیکی سرمایہ سے ہم رشتگی ہی غزل کو غزل بناتی ہے۔اچھی غزل کہنے کے لیے غزل کے اچھے خزینہ سے کسب و استفادہ اور اپنے میڈیم سے مسلسل اشتغال ضروری ہے۔اسی صورت میں فن میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ساجدہ زیدی نظم وغزل کی دونوں اصناف میں درک رکھتی ہیں۔اس لیے جب وہ اس سیاق وسباق میں گفتگو کرتی ہیں تو صرف غزل کا نام نہیں لیتیں، بلکہ وہ مجموعی طور پر علم وادب کے خزانوں کا ذکر کرتی ہیں۔وہ لکھتی ہیں:

> ''شاعری میرے معنوی وجود کی گہری تہوں سے ابلتا ہوا ایسا دریا ہے جس پر روک لگانا ممکن نہیں۔اب یہ اور بات ہے کہ اس دریائے پرشور کی پرداخت بھی کی جاتی ہے۔ریاض ،کشف اور اپنے میڈیم سے مسلسل ربط علم وادب کے خزانوں سے، مطالعہ سے حسب توفیق کچھ حاصل کر سکنے کی لگن بھی اس عمل کا حصہ ہے اور اس کے لیے بھی ایک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق ۔۔۔اور بھی کبھی سوچیے۔اپنی ناکردہ کاری پر نظر کیجیے تو داغ حسرت دل کا شمار یاد آہی جاتا ہے۔اپنی نارسائیوں پر نظر پڑتی ہے تو آتا ہی رہتا ہے۔'' (آتش زیر پا،ص12)

ساجدہ زیدی کی غزلوں میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا ایک بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ اگر ساجدہ زیدی اپنی نظموں کی طرح غزلوں پر بھی فوکس کرتیں تو آج شہریار اور عرفان صدیقی وخلیل الرحمٰن اعظمی جیسے غزل گوشعرا کے ساتھ ان کا بھی نام لیا جاتا۔ساجدہ زیدی کی غزلوں میں جدید اور جدید تر غزلوں کے رجحانات جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی ایک الگ پہچان اور منفرد حیثیت ہے۔

تبصرہ نگار ع ح خ ساجدہ زیدی کی غزل گوئی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''آتش زیر پا کی غزلوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غزلیں اردو غزل کی عظیم روایت سے اپنا مضبوط رشتہ قائم رکھتے ہوئے بھی محض روایتی غزلیں نہیں ہیں۔شاعرہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے، جس نے اس سے یہ غزلیں کہلوائی ہیں۔انھیں محض قافیہ پیمائی کے شوق میں نہیں کہا گیا ہے۔الفاظ وتراکیب کا خوبصورت اور دلکش استعمال، زبان کی بے پناہ روانی اور برجستگی، امیجز کی تازہ کاری اور ندرت فکر کی گہرائی اور سنجیدگی، خلوص اور دردمندی کی آنچ اور نرم دھیما دھیما لہجہ ان غزلوں کا امتیاز ہے''۔

(تیرنیم کش،صفحہ 33،شمارہ،فروری 1997)

غرض ساجدہ زیدی اپنی روایت سے منسلک بھی ہیں اور نئے رجحانات سے اثر پذیری بھی ان کے یہاں ملتی ہے۔وہ کلاسیکی شعرا سے کسب فیض بھی کرتی ہیں اور اپنا طرز بھی شامل کرتی ہیں۔ان کی شاعری کلاسیکی طرز کے رنگ وبو بھی رکھتی ہے اور جدید رجحانوں سے سیرابی کا پتہ بھی دیتی ہے۔

کسی گناہ سے دامن کو کر لیں آلودہ
حیات تیرہ میں داغوں کی روشنی ہی سہی

اک ذرا صفحۂ دوراں سے ہٹائی تھی نظر
مڑ کے دیکھا تو وہ منظر وہ سماں کچھ بھی نہیں

کیا ملا ہم کو یہی کاوش دوچار نفس
ہے یہی اپنا جہاں اور یہ جہاں کچھ بھی نہیں

Sayma Samreen
Shipra Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067
Mob: 8448556386

شاعرات کے منتخب اشعار

برسوں غم گیسوں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا

اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم
کھڑکی نہ رکھی روزن دیوار تو رکھا

بیگم لکھنوی

کانٹے ہوں یا پھول اکیلے چننا ہوگا
ہم جیسا محتاط ہمیشہ تنہا ہوگا

فکر و تردد میں ہر دم کیا گھلتے رہنا
ہوگا تو بس وہ ہی جو کچھ ہونا ہوگا

بلقیس ظفیر الحسن

آکاش پہ بادل چھائے تھے
آنکھوں نے اشک بہائے تھے

اک لفظ نہ آیا ہونٹوں پر
لمحے بے درد تو آئے تھے

بینا گوئندی

ہٹتا نہیں جو سامنے سے اس کے رات دن
ہم سے سوا ہے طالب دیوار آئینہ

خلوت میں اس کے نور سے عالم ہے طور کا
ہیں آب و تاب سے در و دیوار آئینہ

پروین ام مشتاق

ہے آسیبوں کا سایا میں جہاں ہوں
شب دشت بلا میں بے اماں ہوں

ہوا کی زد پہ جیسے شمع کی لو
میں اپنے حوصلوں کا امتحاں ہوں

پروین شیر

وہ کیا جیے گا جس کو کوئی تجربہ نہ ہو
جب تک کہ زندگی میں کوئی حادثہ نہ ہو

دشوار راستوں سے ڈراتے ہیں کیسے لوگ
جیسے ہمارا کوئی یہاں رہنما نہ ہو

پروین صبا

راز کا حرم میں چرچا کبھی ہونے نہ دیا
ہم نے اپنے کو تماشا کبھی ہونے نہ دیا

ہم کو اس گردش دوراں نے کہیں کا نہ رکھا
پھر بھی لہجے کو شکستہ کبھی ہونے نہ دیا

تسنیم عابدی

ہمیں بربادیوں پہ مسکرانا خوب آتا ہے
اندھیری رات میں دیپک جلانا خوب آتا ہے

ذرا سی بات پہ دیوار کھنچوانے لگا ہے وہ
اسے بھی رائی کا پربت بنانا خوب آتا ہے

چاندنی پانڈے

(بحوالہ ریختہ ویب سائٹ)

ڈاکٹر محسنہ انجم اے انصاری

تعلیم نسواں اور حکومت کی پالیسیاں

عورت سماج کی بنیادی اکائی ہے، تقریباً پوری آبادی کا نصف حصہ ہے، بغیر عورت کے وجود کے ہم سماج کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اور عورت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتے، شاید اسی لیے اقبال نے کہا تھا "وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ"۔ عورت کو بھی ہر شعبے میں سبھی مواقعوں پر برابری کا حق ہونا چاہیے کیوں کہ اگر آدھی آبادی کچھ نہیں کر رہی ہے تو سماج اور ملک کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ عورت بھی ان تمام چیزوں اور مواقعوں کی حقدار ہے جو دوسری صنف کو حاصل ہے۔ کیونکہ اگر مردوں کے برابر عورتوں کو بھی اچھی تعلیم اور روزگار حاصل ہو جائیں تو ملک دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گا اور ایک تعلیم یافتہ عورت نہ صرف اپنا خیال رکھ سکتی ہے، بلکہ اپنے خاندان اور پورے سماج کو بہتر بنا سکتی ہے۔ کچھ خاص صلاحیتوں اور شخصیت کو ابھارنے کے لیے مناسب تعلیم ضروری ہے جو انھیں معروف انسان بناتی ہیں (مختار اور دیگر، 2021)۔

اگر عورت کو مرد کے برابر تعلیم فراہم کی جائے تو سماج کا نقشہ بدل جائے گا، اور عورت کو سماج میں ایک اہم مقام حاصل ہو جائے گا۔ وہ بھی با اختیار ہو جائیں گی اور اس سماج کی بہتری کے لیے اپنا رول ادا کریں گی اسی لیے کسی نے کیا خوب کہا ہے، Educate a girl, Empower "the nation" یعنی لڑکی کو تعلیم دے کر ملک کو با اختیار بنایا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین کو گھریلو اور گھر سے باہر کے معاملات کے بارے میں فیصلہ کرنے میں زیادہ علم ہوتا ہے اور ان کی تولیدی خود مختاری ان پڑھ خواتین کے مقابلے میں بہتر ہوتی ہے (باسو، 1992)۔

ہندوستان میں تعلیم نسواں کی تاریخ

پرانے زمانے میں ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم پر توجہ دی جاتی تھی، خاص کر ویدوں کے زمانے میں کئی عورتیں خود بھی تعلیم حاصل کرتیں اور دوسروں کو بھی سکھاتی تھیں۔ اگرچہ ویدک دور میں خواتین کو ہندوستان میں تعلیم تک رسائی حاصل تھی۔ آہستہ آہستہ انھوں نے یہ حق کھو دیا، اور 582 قبل مسیح کے بعد عورتوں کی تعلیم میں کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کمار (2013) کے مطابق معاشرے میں خواتین کی حالت قرون وسطیٰ کے دوران مزید خراب ہوئی۔ جب مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد ہوئی تو

یہاں کئی برائیاں جیسے بچپن کی شادی، ستی، اور لڑکیوں کی طفل کشی بڑے پیمانے پر تھیں۔ مسلمانوں کی آمد نے پردہ کا نظام شروع کیا اور عورتوں کی حرکت 'زنانہ' تک محدود ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ غیر ملکی حملہ میں شکست کھانے والی قوم کی تمام عورتیں موت کی نذر ہوجاتیں جسے جوہر کہا جاتا تھا۔ کھتری ہندو سماج میں کثیر الازدواجی نظام عام تھا۔ اس کے باوجود بہت سی خواتین نے فنون لطیفہ، ادب، اور موسیقی میں مہارت حاصل کی۔ قرون وسطیٰ میں بھی عورتیں حکمران تھیں۔ جیسے رضیہ سلطان جو دہلی کے تخت پر حکمرانی کرنے والی واحد خاتون بادشاہ تھیں۔ بھکتی تحریک نے خواتین کے مقام کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ میرابائی اپنے بھکتی گیتوں کے لیے مشہور ہوئیں، مگر اس دور میں بھی خواتین کی تعلیم ہر سطح پر عام نہیں تھی۔ امیر اور مشہور گھرانوں کی چند لڑکیاں بنیادی اور مذہبی تعلیم حاصل کرسکتی تھیں۔

برطانوی دور میں ہندوستان میں خواتین کی تعلیم میں دلچسپی کا احیاء ہوا۔ اس دور میں، راجہ رام موہن رائے جیسے سماجی مصلح کی قیادت میں مختلف سماجی مذہبی تحریکیں چلیں۔ مہاتما جیوتی با پھولے اور پیریار ہندوستان میں نچلی ذاتوں کے رہنما تھے جنھوں نے ہندوستانی خواتین کو تعلیم کی فراہمی کے لیے مختلف اقدامات اٹھائے اور آہستہ آہستہ تعلیم نسواں میں برتری تو آئی مگر مردوں کی بہ نسبت کافی پیچھے رہ گئیں۔

اگر ہندوستان میں مردم شماری کو دیکھا جائے تو 2011 میں 74 فیصد کل آبادی خواندہ تھی اور عورتوں کا خواندگی کا فیصد 65.46 فیصد تھا، لیکن عورتوں کی خواندگی میں ہر دہے میں آہستہ آہستہ اضافہ ہورہا ہے۔ اگر یہ اضافہ لگاتار جاری رہا تو وہ دن دور نہیں جب تمام عورتیں خواندہ ہوجائیں گی اور ترقی کے میدان میں اپنے جوہر دکھائیں گی۔ ذیل میں دیے گئے خاکے اور جدول کو غور سے دیکھئے ہر دہائی میں خواندگی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن آخری تین دہائیوں میں کافی زیادہ اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

Year	persons	Male	Female
1901	5.3	9.8	0.7
1911	5.9	10.6	1.1
1921	7.2	12.2	1.8
1931	9.5	15.6	2.9
1941	16.1	24.9	7.3
1951	16.7	24.9	7.3
1961	24	34.4	13
1971	29.5	39.5	18.7
1981	36.2	46.9	24.8

1991	52.1	63.9	39.2
2001	65.38	76	54
2011	74.04	82.14	65.46

(ذریعہ: مردم شماری ہندوستان)

تعلیم نسواں کی اہمیت

تلک (1987) کے مطابق خواتین کی خواندگی کی سطح اور مجموعی ملکی پیداوار (Gross Domestic Product) کے درمیان ایک واضح تعلق موجود ہے اور یہ پایا گیا ہے کہ خواندگی کی سطح میں %20-%30 تک اضافے کے نتیجے میں دنیا بھر کے متعدد ممالک کے لیے جی ڈی پی میں %8-%16 تک اضافہ ہوا ہے۔

مورگن (2007) نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ ترقی کے ہر پہلو میں تعلیم نسواں کو شامل کرنا بے حد ضروری ہے کیونکہ خواتین کو تعلیم فراہم کرنے کی وجہ سے وہ ثمر آور کام میں شامل ہو کر ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اقتصادی تحقیق کے مطابق خواتین کی تعلیم پر کی جانے والی سرمایہ داری ہمیشہ بہترین حصولیابی دیتی ہے اور ساتھ ہی بہت سے مسائل جیسے بچہ اور ماں کی اموات کی شرح کو کم کر دیتی ہے۔ تعلیم خواتین کو مردوں کے برابر کمانے اور حصہ لینے میں مدد دیتی ہے۔

خوشبو (2016) نے لکھا ہے کہ تعلیم یافتہ مائیں اپنے علم کا استعمال اپنے بچوں اور خاندان کے دیگر افراد کی صحت کو بہتر بنانے کے لیے کرتی ہیں۔ صحت کے خطرے کے بارے میں ان کا علم ان کے خاندانوں کو بیماری سے بچاتا ہے۔ بچوں کی اموات کی شرح وہاں پر بہت زیادہ ہے جہاں ماؤں کے پاس تعلیم کی کمی ہے بہ نسبت ان خاندانوں کے جہاں مائیں تعلیم یافتہ ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم ہندوستانی معاشرے کی اولین ترجیحات میں سے ایک نظر آتی ہے۔ "لڑکیوں کو تعلیم دینا کوئی آپشن نہیں ہے، یہ ایک ضرورت ہے"۔ ہم سب تعلیم میں صنفی تفاوت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ویسے تو خواتین کی بااختیاری میں پورے عالم میں جدوجہد چل رہی ہے، ایک بیداری پیدا ہو رہی ہے کہ خواتین کو بھی ہر وہ ذریعہ فراہم ہو جو ان کے مردوں کو حاصل ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی خواتین کی تعلیم کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے (78-1974) سے خواتین کی فلاح اور بااختیاری پر حکومت بہت کچھ سوچ رہی ہے اور کچھ اہم تجاویز بھی پیش کرتی ہے۔ پٹیل (2022) نے اشارہ کیا ہے کہ انیس سو اٹھاون (1958) میں ہندوستان کی حکومت نے National Committee on Women's Education تشکیل دی جس کی سفارشات میں پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے تعلیمی گیپ کو کم کرنا تھا۔ قومی تعلیمی پالیسی (1986) کے پروگرام آف ایکشن (1992) نے خواتین کی تعلیم کو بہت اہمیت دی ہے اور خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے تعلیم کو سب سے اہم آلہ بتایا ہے، تعلیم کے ذریعے خواتین اپنی زندگی کے حالات اور معشیت کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ ڈسٹرکٹ پرائمری ایجوکیشن پروگرام (1994) میں ملک کے ان اضلاع میں شروع کیا گیا جہاں خواتین کی خواندگی ملک کی خواتین کے فی صد سے کم تھی تاکہ ان سبھی اضلاع میں پرائمری تعلیم سبھی تک پہنچائی جائے۔ HRD منسٹری کی طرف سے جاری کردہ ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ اگرچہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینے والی خواتین کی تعداد 201011 میں 12 ملین سے بڑھ کر 201718 میں 17.4 ملین ہو گئی ہے۔ تاہم، خواتین کے لیے پیشہ ورانہ اور ڈپلومہ کورسز میں اب بھی ایک خلا برقرار ہے۔

سابقہ یو این سیکرٹری جنرل کوفی عنان کا کہنا ہے کہ "To educate a girl is to reduce poverty" یعنی اگر غریبی کم کرنی ہے تو لڑکیوں کو تعلیم دو۔ تعلیم سے معلومات کے ساتھ ساتھ عورتوں میں سماج میں اپنا مقام بنانے کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ ان کی self-esteem میں اضافہ ہوتا ہے، سماج میں معاشی مقام حاصل ہوتا ہے، اور ان کی دیگر صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

عورتوں کے تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجوہات

عورتوں کو کئی سالوں سے تعلیم سے دور رکھا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل میں کچھ وجوہات کا ذکر کیا گیا ہے۔

صنفی عدم مساوات: اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو اہمیت نہیں دیتے، 30 فیصد لڑکیاں تو اسکول میں کبھی قدم تک نہیں رکھتیں، یہ سوچ آج بھی ہمارے ملک میں عام ہے کہ لڑکیوں کو تو ویسے دوسرے گھر جانا ہے، تو پڑھا لکھا کر ہمارا کیا فائدہ لیکن یہ سوچ سراسر غلط ہے۔

شریک تعلیم (co-education): بہت والدین لڑکیوں کو پڑھانا چاہتے ہیں، لیکن لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ نہیں پڑھانا چاہتے اور خالص لڑکیوں کے اسکول ہر جگہ دستیاب نہیں ہیں۔

گھر سے اسکول کا فاصلہ: گھر سے اسکول کتنی دوری پر ہے یہ بھی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے روکاوٹ کی ایک اہم وجہ بنتی ہے۔ اگر اسکول گھر کے قریب ہے تو والدین اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیج دیتے ہیں، ورنہ لڑکیوں کی حفاظت کے خوف سے اسکول نہیں بھیج پاتے۔

گھر کی ذمہ داریاں: لڑکیوں کو چھوٹی سی عمر سے ہی گھر کی ذمہ داریاں اپنے

چھوٹے بھائی بہنوں کا خیال رکھنا اور گھر میں ماں کا ہاتھ بٹانا، مدد کرنا اہم کام سمجھا جاتا ہے۔ ان سب کاموں سے فرصت مل جائے تو لڑکیوں کو اسکول بھیج دیا جاتا ہے جو کہ غیر اطمینان بخش ہے۔

لڑکیوں میں ڈراپ آؤٹ اور جمود کے واقعات پورے ہندوستان میں لڑکوں کے مقابلے میں تقریباً دوگنا ہیں۔ بہت سے خاندان خاص طور پر غریب اور پسماندہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر ان کی بیٹیاں زیادہ تعلیم یافتہ ہوں تو انہیں جہیز کے طور پر فراہم کرنے کے لیے زیادہ اثاثے اور جائیدادیں جمع کرنی ہوں گی۔

تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے سرکاری اسکیم و پالیسیاں

ہندوستان کا آئین نہ صرف خواتین کو برابری فراہم کرتا ہے بلکہ ریاست کو یہ اختیار بھی دیتا ہے کہ وہ خواتین کے حق میں مثبت امتیازی اقدامات کو اپنائے تاکہ ان کو درپیش مجموعی سماجی معاشی، تعلیمی اور سیاسی نقصانات کو بے اثر کیا جا سکے۔ کچھ اہم آرٹیکل مندرجہ ذیل ہیں۔

آرٹیکل 21A– ریاست چھ سے چودہ سال کی عمر کے تمام بچوں کو اس طریقے سے مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی جیسا کہ ریاست، قانون کے ذریعے، تعین کرے۔ (آٹھویں ترمیمی ایکٹ، 2002)

آرٹیکل 15۔ مذہب، نسل، ذات، جنس یا جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک کی ممانعت۔

آرٹیکل (3)15- کوئی بھی چیز ریاست کو خواتین اور بچوں کے لیے کوئی خاص بندوبست کرنے سے نہیں روکے گی۔

آرٹیکل (a)39- شہریوں، مردوں اور عورتوں کو یکساں طور پر، مناسب ذریعہ معاش کا حق حاصل ہے۔

بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم کا حق ایکٹ 2009، مختلف سطحوں پر سرکاری حکام کے مناسب فرائض بتاتے ہوئے، ایکٹ میں والدین اور سرپرستوں کے فرائض بھی شامل کیے گئے ہیں کہ وہ اپنے بچوں/ وارڈز کو پڑوس کے اسکولوں میں ابتدائی تعلیم کے لیے داخل کرائیں۔ عام طور پر لڑکیوں کے بارے میں والدین کا متعصّبانہ رویہ اور خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں امید ہے کہ ایکٹ کے نفاذ سے تبدیلی درج کی جائے گی۔

قومی کمیشن برائے خواتین (NCW) 1992 میں قائم ایک قانونی ادارہ، خواتین کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ خواتین اور بچوں کی ترقی کی وزارت خواتین اور بچوں کی ترقی کی وزارت ملک میں خواتین اور بچوں کی بہبودی، ترقی اور بااختیار بنانے سے متعلق تمام امور کے لیے نوڈل ایجنسی ہے اور مختلف شعبوں میں خواتین کے مخصوص پروگراموں کی تشکیل اور نفاذ کے لیے ذمہ دار ہے۔

بیٹی بچاؤ، بیٹی پڑھاؤ: 2015 میں ہندوستان کی حکومت نے یہ اسکیم جاری کی، جس کا اہم مقصد صنفی تعصب کو روکنا ہے، اور لڑکیوں کی زندگی کو تحفظ فراہم کرنا اور تعلیم میں لڑکیوں کی حصہ داری کو یقینی بنانا ہے۔

کستوربا گاندھی بالکا ودیالیہ اسکیم (KGBV)

یہ اسکیم جولائی 2004 سے شروع کی گئی سرکاری اسکیم ہے جس کے تحت دیہات اور نچلے طبقات کی لڑکیوں کے لیے اقامتی اسکول قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں سیکنڈری اسکول کے لڑکیوں کو معیاری تعلیم فراہم کی جاتی ہے ان سکولوں کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ بلاکس، جہاں دیہی خواتین کی خواندگی قومی سطح سے کم پائی جاتی ہو ان مقامات میں قائم کیا گیا ہے، خاص کر جہاں خواتین کی خواندگی 30 فیصد سے بھی کم پائی جاتی ہو۔

ابتدائی تعلیم میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قومی پروگرام

National Programme for Education of Girls at Elementary Education

NPEGEL کو 2003 سے جاری کیا گیا جو سرو شکشا ابھیان کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس پروگرام میں لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی کے لیے خاص اقدامات اٹھانا مقصود تھا۔ اس اسکیم کے تحت لڑکیوں کے مخصوص اسکول یعنی ماڈل اسکول بنانے کی پیشکش کی تھی، جس میں زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کے داخلہ کو یقینی بنانا تھا۔

نتیجہ

ان تمام اسکیموں اور افراد میں تعلیمی بیداری کے سبب شہری علاقوں میں خواتین تعلیمی میدان میں کچھ حد تک کامیابی کے جوہر دکھا رہی ہیں۔ لیکن دیہی اور پسماندہ علاقوں میں ابھی بھی خواتین تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں۔ سب سے پہلے تعلیم کی اہمیت کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں میں علم حاصل کرنے اور سیکھنے کا مادہ ہی ان کو تعلیم اور اسکول کی طرف راغب کر سکتا ہے اور ساتھ ہی تعلیم میں خواتین کی عدم شرکت کی وجوہات کی نشاندہی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مختلف اسٹیک ہولڈرز کو ان علاقوں میں گھر گھر جا کر مہم چلا کر ایک پہل کرنی چاہیے جہاں تعلیم میں خواتین کا داخلہ کم ہے۔ خواتین اور ان کے خاندان کے افراد کی مناسب کونسلنگ کی ضرورت تا کہ ان کا رویہ بدلا جاسکے اور انھیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ ملک کی معاشی ترقی کے لیے ترغیب دی جائے۔

تعلیم خاندان میں عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے ایک ذریعہ کے علاوہ عدم مساوات میں کمی بھی لاتی ہے۔ مندرجہ بالا نکات کو دیکھنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ہمارے اکابرین نے دستوری تحفظات فراہم کیے تا کہ بلا تفریق لڑکیوں کو اچھی تعلیم فراہم کی جائے۔ ملک میں قائم کیے بعد دیگرے حکومتوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مختلف اسکیمات نافذ کی ہیں۔ ہر سطح پر خواتین کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرنے اور علم اور تعلیم کی فراہمی میں صنفی تعصب کو کم کرنے کے لیے ریاست میں خواتین کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنی چاہیے۔ ایک پڑھی لکھی عورت بچوں، خاندان کے افراد، معاشرے اور قوم کے لیے مشعل راہ ہوتی ہے، وہ جانتی ہے کہ کس طرح خوش حال خاندان اور دوسروں کے ساتھ متوازن اور صحت مند تعلقات رکھے جاتے ہیں۔ عورتوں کی تعلیم سے ملک کی ترقی جڑی ہوئی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ عورت ایک بہترین سماج کو تشکیل دے گی۔

□□□

Dr. Mohasina Anjum Ansari
Assistant Professor
Department of Education & Training,
Gachibowli
Hyderabad 500032 (T.S)
mohasinaans@gmail.com
Mob.: 9441736021

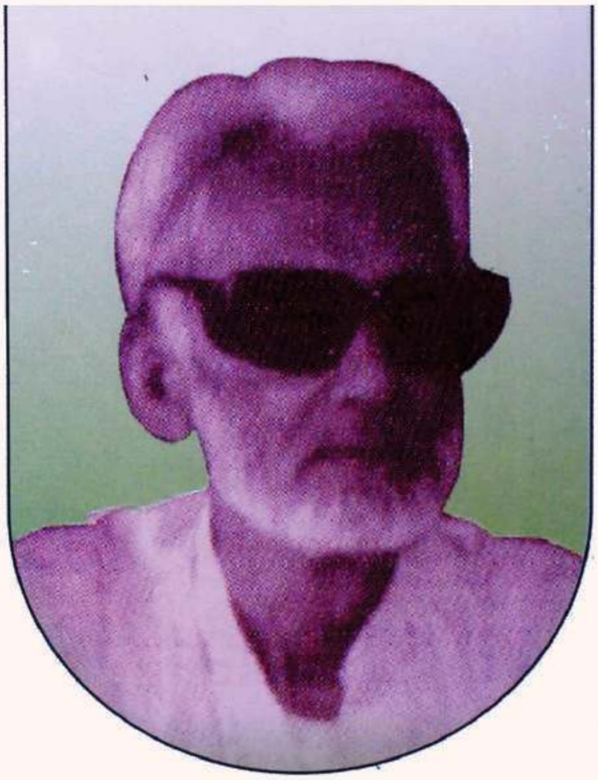

ڈاکٹر صوفیہ شیریں

شین مظفر پوری
کے فکشن کے نسوانی کردار

وکی پیڈیا کی تعریف کے مطابق افسانے کے اہم اجزا واقعہ، پلاٹ، کردار اور اسلوب (بیانیہ) ہیں۔ اردو کے بیشتر نقادوں نے بھی افسانے میں پلاٹ اور کردار کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ پلاٹ، افسانے کا تانابانا بنتا ہے۔ کردار اسی تانے بانے میں نہ صرف حقیقت کا رنگ بھرتا ہے۔ بلکہ اسے عام زندگی سے قریب تر کر دیتا ہے۔ کردار جتنا فعال اور جاندار ہوگا، افسانہ اسی قدر توانا ہوگا۔ افسانے میں چونکہ مختصر وقت اور الفاظ میں کردار کے تاثر کو ابھارنا مقصود ہوتا ہے اس لیے یہاں افسانہ نگار کو زیادہ احتیاط اور فنی باریکیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وقار عظیم کے مطابق:

> ''افسانے کے پلاٹ، اس کی ترتیب اور اس کی تحریک کو جتنا ضروری بتایا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ ضروری خود افسانوی کردار ہیں۔ (یعنی افسانے کے کردار) اس لیے افسانوی فن کو تحریک میں لانے کے لیے ہمیں کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (فن افسانہ نگاری، وقار عظیم، صفحہ-148)

چونکہ کردار افسانوی روپ کا خاص جزو ہے اور افسانوی فن کی جانچ پرکھ کردار نگاری میں فنکار کی مہارت کا جائزہ لیے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کسی داستان، ناول، افسانے، ڈرامے یا کسی منظوم کہانی پر بحث کرتے ہوئے اور اس کا ادبی مقام متعین کرنے کی غرض سے ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے مصنف نے کتنے زندہ کردار تخلیق کیے ہیں اور کردار نگاری میں کن صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

شین مظفر پوری کی خوبی ہے کہ جو باتیں ان کے افسانوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی ہیں ان میں زندگی کا کوئی نہ کوئی رخ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف حالات اور حقائق تک ان کی نظریں بڑی بے باکی کے ساتھ پہنچتی ہیں اور ان کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور اس کے رنگارنگ پہلوؤں کو شدت سے محسوس کیا زندگی کے ان رنگارنگ پہلوؤں کی پیشکش کے لیے شین کے کردار بہترین ذریعہ ہیں۔ مردانہ کرداروں میں بابو رام کنور' نوشیر خاں' سرجو استاد' شیر سنگھ' عظیم' ناصر وغیرہ ہمیں کافی متاثر کرتے ہیں۔

جس طرح ہر شئے کا ایک مرکز ہوتا ہے، اسی طرح ادب اور خصوصاً اردو ادب کا ایک مرکز ہے اور وہ ہے عورت۔ ابتدا ہی سے افسانہ طبقہ نسواں کی آزادی اور اصلاح و بہبود کی راہ پر انتہائی دردمندی کے ساتھ چل نکلا۔ افسانوں اور ناولوں سے قبل اردو ادب میں عورتوں کو ایک الگ نظریے سے

پیش کیا جاتا تھا جن میں زیادہ تر ان کے حسن و جمال کی باتیں ادب کا حصہ بنتی تھیں لیکن ڈپٹی نذیر احمد، رسوا، پریم چند، بیدی، کرشن چندر، منٹو، عصمت، قرۃ العین حیدر جیسے فکشن رائٹرس نے عورتوں کے کردار اور افعال کو بدلنے کی کوشش کی۔ شین مظفر پوری کے افسانوں کی نسوانی آواز بڑی مضبوط ہے۔ ان کے یہاں عورت حسن و شباب کے اعتماد سے بھرپور نظر آتی ہے۔ وہ مرد سے اپنا حق مانگتی نہیں بلکہ حاصل کر لیتی ہے۔

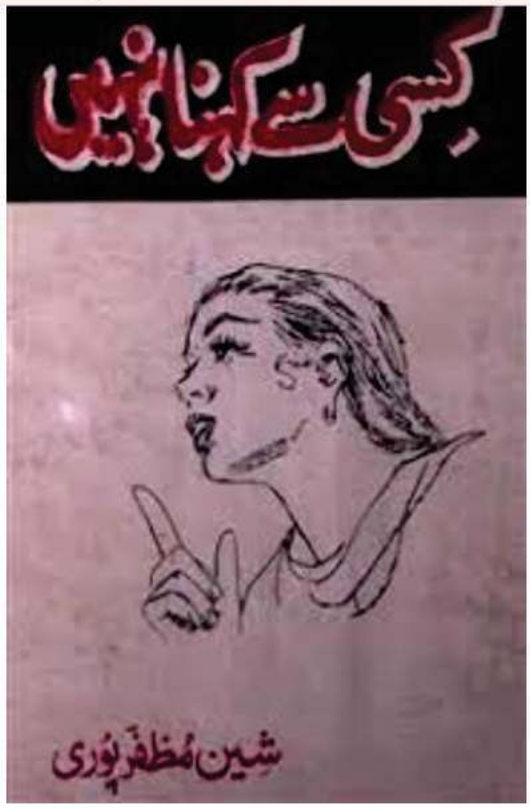

اچھی کردار نگاری کی پہچان یہ ہے کہ اس سے فرد کی نفسیات پوری طرح سے سامنے آ جائے، ایسے کردار مکمل ہوتے ہیں۔ شین کا بڑا وصف کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ وہ کرداروں میں ڈوب کر انھیں اپنی مرضی سے پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں تو نفسیاتی کشمکش مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسانی ذہن بیک وقت تین دنیاؤں شعور، لاشعور اور تحت الشعور میں محرک رہتا ہے۔ تحت الشعور میں ہماری دبی ہوئی اور ناکام تمنائیں ہوتی ہیں جبکہ شعور وہ ہے جو ہمہ وقت فعال رہتا ہے اور لاشعور میں حالات پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ شین کے بعض کرداروں میں یہ تینوں شعور فعال اور متحرک محسوس ہوتے ہیں۔ ''دل کا چور'' کی عروسہ شادی کو ایک مقدس فریضہ سمجھ کر نبھاتی ہے۔ شوہر کی بے روزگاری کے باوجود ہمہ وقت اس کی دل جوئی کرتی ہے، اور اپنے ہر عمل سے یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ دنیاوی آسائشوں اور نعمتوں کی آرزومند نہیں۔ عظیم کو یقین ہے کہ عروسہ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ وہ سوچتا ہے:

''محبت وہ لافانی نعمت ہے جن کے سوا تمہیں کچھ اور نہیں چاہئے۔ وہ مقدس چیز جس نے تمہیں ایک ارضی وجود سے آسمانی ہستی بنا دیا ہے۔''

(دل کا چور مشمولہ کسی سے کہنا نہیں، ص-15)

عروسہ کے گھر شادی کی تقریب ہے۔ عظیم اور عروسہ دونوں ہی جانے والے ہیں۔ عظیم شرمندہ ہے کہ اس کے پاس عروسہ اور اس کے گھر والوں کو تحفہ دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ عروسہ اسے یقین دلاتی ہے کہ اسے عظیم کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔ اچانک عظیم کو تکیے کے نیچے سرسراتی ہوئی کوئی شئے دکھائی دیتی ہے۔ استفسار کرنے پر عروسہ بتاتی ہے کہ چندن ہار ہے شادی میں پہننے کے لیے ماں جی نے پڑوسن سے مانگ کر دیا ہے۔

کہانی کے اختتام پر شین نے بشری نفسیات پر سے پردہ ہٹا کر ارضی حقیقت اور بشری زندگی کی واقعیت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ عورت کے ذہن و مزاج سے یہ نفسیاتی واقفیت شین مظفر پوری کے پرزور مشاہدہ اور نفسیاتی دروں بینی کا غماز ہے۔ عروسہ کا شادی میں چندن ہار پہننے کی خواہش رکھنا دراصل عورت کی فطرت و جبلت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ عورت کتنی ہی تیاگ و قربانی کی مورت بن جائے اس کا مادی خواہشوں سے منھ موڑنا آسان نہیں۔ عروسہ ایک عورت ہے اور بیدی کی لاجونتی کی طرح عورت ہی رہنا چاہتی ہے، کوئی دیوی نہیں بننا چاہتی۔

شین مظفر پوری کے افسانوں میں عورت مختلف انداز اور کرداروں میں سامنے آتی ہے۔ شین عورت کے ان گنت روپ اور چہرے قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ ہر چہرہ نت نئے نقش و نگار سے آراستہ ہے اور اپنا ایک الگ اور منفرد تاثر رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال ''عورت تیرے کتنے روپ'' اور ''طلاق، طلاق، طلاق'' ہے۔ عورت تیرے کتنے روپ کی ربیعہ بچہ نہ ہونے کی صورت میں ناصر سے علیحدہ ہو جاتی ہے اور دو بچے کے باپ سے شادی کرتی ہے لیکن اپنے پہلے بچے کی ولادت کے چند دنوں بعد ہی موت کی آغوش میں سما جاتی ہے۔ مرنے سے قبل اپنے شوہر سے وعدہ لیتی ہے کہ وہ یہ بچہ اس کے پہلے شوہر کو دے دے۔ اس طرح ربیعہ ناصر سے الگ ہو کر اسے اولاد کے سکھ سے ہمکنار کرتی ہے۔ یہ کہانی عورت کی نفسیات کے ساتھ اس کی عظمت، محبت اور ایثار و وفا کی داستان سناتی ہے۔ دوسری طرف ''طلاق، طلاق، طلاق'' کی شہناز ہے جو عارف کے نکاح میں ہونے کے باوجود غیر مردوں سے راہ رسم رکھتی ہے۔ دراصل وہ شادی سے قبل ہی

ضروری تھی۔ کہتے ہیں فطرت نہیں بدلتی۔ شہناز کی بے راہ روی سے بے زار ہوکر عارف اسے طلاق دے دیتا ہے۔ لیکن شہناز نہ صرف بدچلن ہے بلکہ عیار اور مکار بھی ہے۔ وہ قانون کا سہارا لے کر عارف سے طلاق کے عوض اچھا خاصہ معاوضہ وصول کرتی ہے۔ یہ دو متضاد کردار اس قول کی پیروی کرتے ہیں کہ عورت کا منفی کردار بھی ہے اور مثبت بھی۔

جیسا کہ قبل ذکر ہو چکا ہے کہ شین کے افسانوں کی نسوانی آواز بڑی مضبوط ہے۔ یہ مظالم اور جنسی و جذباتی محرومیوں کے شکار نہیں بلکہ معاشرے کے فرسودہ رسم و رواج کے سامنے صدائے احتجاج نظر آتے ہیں۔ ہاں ان کے احتجاج کا انداز ضرور مختلف ہے۔ انتہائی جذباتیت کے عالم اور شدید غصہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ گم ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے غصے اور حقارت کا اظہار تھوک کر کرتے ہیں۔ جب ''کسی سے کہنا نہیں'' کی دسادھن کے دودھ کی قیمت لگائی گئی اور اسے ذلیل کیا گیا تو زہریلا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

''میلی ہریجن عورت کے جسم میں خون کے بجائے تیزاب دوڑنے لگا...... وشال گنگا کی بے کراں وسعتوں کو نگاہوں میں سمیٹتی ہوئی وہ سوچ رہی ہے۔ کیا کوئی سنگین بات ہوگئی ہے۔'' (کسی سے کہنا نہیں مشمولہ کسی سے کہنا نہیں۔ ص-33)

وہ نوٹوں کو پھاڑ کر گنگا میں بہادیتی ہے اور اونچی ذات کی نیچی سوچ پر تھوک کر اپنے اندر کی تمام کثافت نکال دیتی ہے۔ ساتھ ہی ڈھلکے ہوئے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر ساحل کی ریت میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ''کیا جینا کیا مرنا'' کی کامنی بھی سرجو استاد پر تھوک کر اپنے اندر کی کڑواہٹ اس کے چہرے پر اگل دیتی ہے اور اسے موت کی سزا دینے کی بجائے ذلت بھری زندگی دیتی ہے:

''پلٹ کر سرجو استاد کے چہرے پر تھوک دیا اور گوتم کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔'' (کیا جینا کیا مرنا، مشمولہ قانون کی بستی۔ ص-158)

''قانون کی بستی'' کی ''چمپا'' کا احتجاج ان سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ شیر سنگھ اسے گاؤں سے اٹھا کر ڈاکوؤں کے اڈے پر لاتا ہے۔ چمپا نہ صرف چیختی چلاتی ہے بلکہ شیر سنگھ پر ہاتھ بھی اٹھاتی ہے۔ اپنی عصمت کی خاطر ڈٹ کر کھڑی ہوتی ہے اور شیر سنگھ کو بکری سنگھ بننے پر مجبور کرتی ہے۔ آخر کار بیوی کا رتبہ حاصل کر اسے ڈاکو سے ایک معاشرتی انسان بننے پر مجبور کرتی ہے۔ شیر سنگھ اسے بھی ڈاکہ کے کام میں شامل ہونے کو کہتا ہے تو چمپا پھنکار اٹھتی ہے:

''بس بکواس بند کرو یہی بہت ہے کہ میں نے تم جیسے ڈاکو لٹیروں کو پتی مان لیا ہے۔ میں تمھاری بیوی تو بن سکتی ہوں مگر تمھارے اس ذلیل کام میں تمھارا ساتھ ہرگز نہیں دے سکتی۔ اگر پھر کبھی ایسا کہا تو زبان کھینچ لوں گی۔''

(قانون کی بستی مشمولہ قانون کی بستی، ص-13)

''سرد جنگ'' کی شاہینہ پڑھی لکھی، سمجھدار، سنجیدہ اور متین لڑکی ہے۔ ناصر کی بے التفاتی اور بے وفائی پر کمزور عورتوں کی طرح روتی بلکتی نہیں۔ شوہر کے قدموں پر گر کر وفا کی طالب بھی نہیں نہ ہی چیخ چلا کر اپنے حقوق کی طلب گار۔ اسے اپنے نسائی وقار کا پورا خیال ہے۔ بناؤ سنگھار سے بھی اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ ایک بار اس احساس سے اسے سخت دھچکا لگا کہ:

''کیا وہ کوئی بازاری عورت ہے جو مرد کو رجھانے کے لیے ہر گھڑی بنی ٹھنی رہے! یہ اس کی ذات کی توہین تھی۔ اس کی غیرت کو جھٹکا لگا اور اس کے اندر ردِعمل کا رجحان پیدا ہو گیا۔''

(سرد جنگ مشمولہ نئی الف لیلیٰ، ص-126)

شاہینہ نے ناصر کی بے التفاتی کے ردِعمل کے طور پر خاموشی اختیار کر لی اور خود کو گھریلو ذمہ داریوں میں گم کر دیا۔ شاہینہ کے اسی رویئے نے ناصر کو پریشان کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہینہ اس سے کچھ پوچھے۔ اس پر کچھ اعتراض کرے۔ کچھ خفگی اور شکایت کا اظہار کرے۔ مگر:

''حرفِ شکایت زبان پر لانا اس کی فطرت نہ تھی۔ وہ بڑی خاموش اور گہری عورت تھی۔ اندر ہی اندر سلگنا جانتی تھی۔''

(سرد جنگ مشمولہ نئی الف لیلیٰ، ص-125)

شاہینہ کا خاموش احتجاج رنگ لایا اور ناصر مسلسل لغزشوں کے بعد اپنی حقیقی خوشیوں کی طرف لوٹ آیا۔ افسانہ ''چاندنی'' کی چاندنی کی شادی ایک نامرد سے ہوتی ہے لیکن اسے یہ کربناک زندگی منظور نہیں۔ وہ شوہر کو چھوڑ کر اپنے محبوب کو اپنا لیتی ہے اور مسرتوں بھری دنیا چن لیتی ہے۔ ''نہ جینے دو گے نہ مرنے دو گے'' کی رخسانہ زبان دراز ہے۔ اس کی عادتوں سے ناراض اس کا شوہر اس سے بے زار ہے۔ رخسانہ اسے منانے کے سو سو جتن کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی نسائی شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر بن سنور کر شوہر کو رجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ کوششوں میں ناکام وہ اپنی توہین برداشت نہیں کر پاتی۔ گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور خودکشی کی بھی کوشش کرتی ہے۔ دراصل رخسانہ ایک عورت ہے اور عورت سب کچھ سہہ سکتی ہے لیکن اپنی محبت کی توہین اور محبوب کی بے التفاتی برداشت نہیں کر سکتی۔ احتجاجاً وہ گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

شین مظفر پوری کے نسوانی کردار کسی نہ کسی طرح اپنا احتجاجی رویہ درج کرواتے ہیں۔ کبھی خاموش رہ کر، کبھی تھوک کر، کبھی چیخ چلا کر اور کبھی خودکشی کی کوشش کر۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان میں احتجاج نہ ہو تو وہ مٹی کا تودہ ہے۔ یہ کردار نہ صرف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہیں بلکہ ان میں فیصلہ لینے کی قوت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے برعکس ان کے ناولوں کے نسوانی کرداروں میں جہد و عمل اور برسرِ پیکار ہونے کی صلاحیت کم ہے۔ ان میں فرار اور گریز کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ناول ''ہزار راتیں'' 1955 کی منی، ''چاند کا داغ'' 1956 کی سلطانہ، ''تین لڑکیاں ایک کہانی، 1959'' کی شکیلہ، جمیلہ اور حمیدہ اور ''کھوٹا سکہ'' 1961 کی فرحت یہ تمام نسوانی کردار دلچسپ ضرور ہیں لیکن ان میں حالات سے لڑنے کا حوصلہ نہیں۔ نہ ہی ''منی'' حالات سے لڑ کر محنت مزدوری کرتی ہے۔ نہ ہی ''سلطانہ'' ساس کے طعنے سن کر بھی اپنے شوہر اور بچی کی محبت میں قناعت کر گھر کی چہار دیواری میں محفوظ رہتی ہے اور نہ ہی سکینہ اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھ خود کو غلط راستے پر چلنے سے روک پاتی ہے۔ یہ تمام کردار مخصوص حالات کے پروردہ ہیں۔ سبھی سماجی مظالم کے شکار ہیں لیکن وہ اپنے گرد و پیش سے بلند ہو کر اس پر غالب نہیں آتے بقول عبدالمغنی:

''ایک قسم کی معاشی جبریت ان کی یکتائی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اس جبریت کے خلاف ہم جتنا بھی احتجاج کریں اور مظلوم فرد کے ساتھ جتنی ہمدردی ظاہر کریں بہر حال وہ انسان جو ''صنم کدۂ کائنات'' میں محفل گزار ہو سکتا تھا، اس میں کھو کر گرمئ محفل سے پگھل جاتا ہے۔ اس معاملے میں شین صرف حقیقت پسند اور واقعیت نگار ہیں۔ وہ اصولی مثالی پسندی انہیں میسر نہ آ سکی جو سرِ عالم سے گزر جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ منی، سلطانہ اور مسعود جیسے زندہ کردار انجم ضو کی مانند، طلسم مہتاب میں گرفتا ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

(جادۂ اعتدال، عبدالمغنی، ص-326)

''ہزار راتیں'' کی منی کو ناول نگار نے جسم فروشی تک ہی محدود رکھا ہے۔ اسے بازارِ حسن کی فنکاری سے بھی کوئی غرض نہیں، نہ ہی وہ امراؤ جان ادا کی طرح آرٹ سے وابستہ ہے۔ دراصل امراؤ جان ادا جیسی طوائفوں کو ادب اور آرٹ کی تعلیم دی جاتی تھی جبکہ منی جیسی بازاری عورتوں کو جسم فروشی کے نت نئے طریقوں اور جیب کاٹنے جیسے دوسرے غیر شریفانہ کاموں کی تعلیم ملتی ہے۔ وہ کئی بار سوچتی ہے کہ:

''وہ جسم فروشی کے علاوہ اور کون سا کام کر سکتی ہے پر ہر بار وہ اس نتیجے پر پہونچتی ہے کہ وہ کوئی دوسرا کام کر ہی نہیں سکتی۔''

(ہزار راتیں، شین مظفر پوری، ص-89)

منی اپنی موجودہ گناہ آلود زندگی سے بے زار ہے اور ضمیر کی ملامت پر اس دنیا سے نکلنا بھی چاہتی ہے پر عمل کی کمی اسے ہمیشہ ہی ان تنگ و تاریک گلیوں کا امین بنائے رکھتی ہے۔ منی تو خیر فٹ پاتھ پر پلی بڑھی ایک یتیم اور ان پڑھ لڑکی ہے پر سلطانہ اور فرحت تعلیم یافتہ اور باشعور خواتین ہیں۔ فرحت کا ایک نوکری پیشہ لڑکی سے طوائف مہہ جبیں میں تبدیل ہو جانا عجیب سا لگتا ہے اور اس پر مصنف کا یہ جواز کہ وہ فطری طور پر ڈرپوک واقع ہوئی ناقابلِ قبول ہے۔ جبکہ پورے ناول میں اس کا کردار تیز و طرار، دور اندیش اور حاضر جواب لڑکی کے روپ میں ابھرتا ہے۔ ایسی لڑکی کا خود کو آسانی سے ماحول کے حوالے کر دینا اور ایک دلال کے ذریعہ بمبئی کے بالا خانوں تک پہنچنا قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

فرحت کی طرح سلطانہ میں بھی نامساعد حالات سے چھٹکارا پانے کی جد و جہد مفقود ہے۔ سلطانہ کا جذباتی پن، بغاوت و سرکشی کا جذبہ، صحیح فیصلہ نہ کر پانے کی عادت اور اس کا ذہنی انتشار اسے زندگی کے اس بھیانک

موڑ پر لے آتا ہے جہاں وہ ایک بار گرتی ہے تو پھر گرتی ہی چلی جاتی ہے۔ حالاں کہ وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے پر افسوس عقل وشعور کی دولت سے محروم۔اس کی ناعاقبت اندیشی اور جذباتی پن اس کی زندگی کا رخ ہی موڑ دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت شکیلہ کی بھی ہے۔کم عمری کی شادی فکشن کا اہم موضوع رہا ہے تاہم آج بڑھتی عمر میں شادی ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ انتہائی نازک ہو گیا ہے۔

''تین لڑکیاں ایک کہانی'' کی شکیلہ بھی بڑھتی عمر اور فطری وجبلی تقاضوں سے پریشان اپنے لیے ایک ایسے راستے کا انتخاب کرتی ہے جہاں فرار کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔لہٰذا زندگی بھر کی رسوائی اپنے خاندان والوں کی نذر کر وہ فرار ہو جاتی ہے۔جبکہ ایسے ہی حالات سے ''زہرا'' بھی گرفتار ہے۔''زہرا''شین مظفر پوری کے مشہور ریڈیائی ڈرامہ ''خون کی مہندی'' کا مرکزی کردار ہے۔زہرا اور شکیلہ کے حالات میں یکسانیت کے باوجود دونوں کا ردعمل بالکل مختلف ہے۔زہرا کا خودکشی کا فیصلہ اس نام نہاد سماج کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ڈراما کا موضوع سماج کی سب سے بدترین لعنت ''جہیز'' ہے۔

زہرا، عائشہ اور رشید کی بیٹی ہے جس کی شادی جہیز اور تلک کی رقم کی وجہ سے نہیں ہو پا رہی ہے۔زہرا کی عمر مشکل سے بیس اکیس سال ہے۔والدین شادی کے لیے کافی فکر مند ہیں۔کئی جگہ بات چلتی ہے،لیکن سسرال والوں کی مانگ پوری نہ کر پانے کی صورت میں رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔

یہ پریشانی صرف عائشہ اور رشید کی نہیں بلکہ سماج کے تقریباً سبھی متوسط اور غریب طبقے اس لعنت سے جوجھ رہے ہیں۔زہرا اپنے والدین کی باتیں چھپ کر سنتی ہے۔اسے بڑا رنج ہوتا ہے۔رات کی تاریکی میں وہ اپنی قسمت پر روتی ہے۔اس کے سسکنے اور ہچکیاں لینے کی آواز سے اس کی بھابھی فاطمہ جو ایک نیک دل خاتون ہے اسے ڈھارس دیتی ہے اور اسے سمجھاتی ہے۔زہرا جذباتی لڑکی ہے۔اس کی بھابھی کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے زہرا شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔وہ اپنوں کے خون سے مہندی نہیں لگانا چاہتی۔زہرا کی بے بسی اور محرومی ملاحظہ فرمائیں :

''کیا اسی کو شادی کہتے ہیں؟ کیا میں تم سب کو کفن پہنا کر خود سہاگ کا جوڑا پہنوں؟ مجھ سے یہ ہرگز نہ ہوگا۔ماں باپ کی قبر پر میں سہاگ کی سیج نہیں سجا سکتی۔میں اپنی ڈولی لاشوں پر سے گزرنے نہیں دوں گی۔میں اپنی تمناؤں کا خون کر سکتی ہوں لیکن خاندان کی بربادی برداشت نہیں کر سکتی۔میں اپنے ہاتھوں میں خون کی مہندی نہیں لگا سکتی۔اس شادی سے موت بہتر ہے۔'' (خون کی مہندی،شین مظفر پوری،ص-184)

زہرا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کے والدین اپنا مکان فروخت کر اس کی شادی کرواتے ہیں لیکن سہاگ کی سیج پر ہی زہرا، زہر کھا کر خودکشی کر لیتی ہے۔اس کا شوہر بشیر نادم ہوتا ہے۔سخت شرمندگی کے عالم میں زہرا سے معافی مانگتا ہے۔زہرہ کہتی ہے :

''تم کس کس سے معافی مانگو گے۔مجھ جیسی ایک لڑکی ہر روز اس سماج میں خودکشی کرتی ہے۔مجھ جیسی ایک لڑکی ہر روز اس سماج میں غلط راستے پر چل پڑتی ہے۔مجھ جیسی ایک لڑکی ہر روز خون کی مہندی لگا کر سہاگن بنتی ہے۔میرے جیسا ایک خاندان ہر روز اس سماج میں برباد ہوتا ہے۔تم لوگ کس کس سے معافی مانگو گے۔'' (خون کی مہندی،شین مظفر پوری،ص-10)

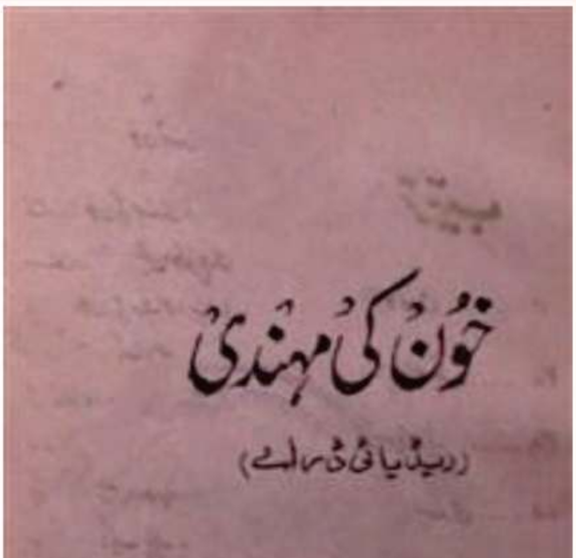

بشیر شرمندہ تو ہے لیکن بزدل ہے۔اس کے برعکس زہرا کا کردار بڑا جان دار ہے۔پورے ڈرامے میں زہرا ہی زہرا چھائی ہے۔اس کی سوچ ایک پڑھی لکھی، سمجھ دار، حساس اور غیور لڑکی کی ہے۔خودکشی کا فیصلہ اس کی بزدلی نہیں بلکہ اس کے غیرت مند ہونے کا ثبوت ہے۔بحیثیت ایک عورت اسے اپنی توہین قبول نہیں۔

شین کے نسوانی کرداروں کا جائزہ لیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کے کردار منطقی بنیادوں پر کم اور جسمانی، حسیاتی یا جبلی سطح پر زیادہ ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ کسی واقعہ کے حسی اور جنسی پہلو کو ایک ساتھ برت ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں پہلو ایک دوسرے کو روشن اور واضح کرتے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں ان کی بیوی ''بولتی آنکھوں اور ملکوتی حسن'' کے ساتھ موجود ہے۔ اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپی عورت (ان کی بیوی) کا احترام اور اس سے اس قدر شدید عقیدت کے باعث وہ عورت کی سماجی بدحالی کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان پر نئے زاویوں سے روشنی ڈالتے اور انجانے حقائق کو واضح کرتے ہیں۔

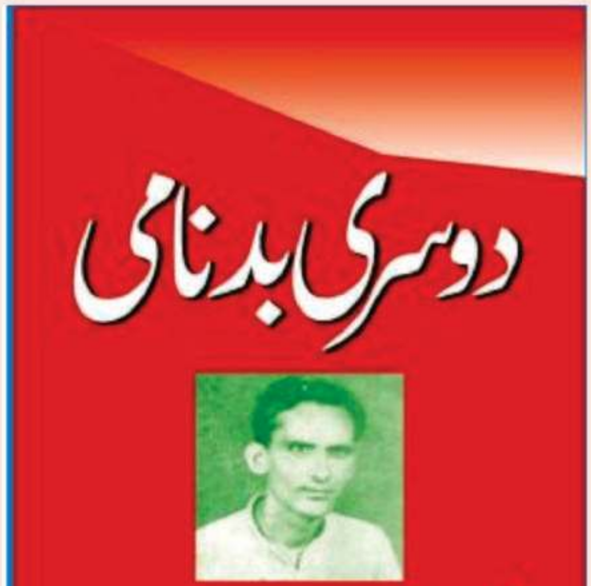

شین کا خاص وصف حقیقت پسندی ہے۔ اس حقیقت پسندی کے اظہار کا ذریعہ ان کے کردار ہیں۔ ان کے کردار محض کٹھ پتلی بننے کے بجائے انسانی زندگی کی پے چیدگیوں کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور اپنے داخلی و خارجی احوال میں پڑھنے والے کو شریک کر لیتے ہیں۔ شین مظفر پوری کے کردار تخلیقی یا داستانوی دنیا کے نہیں ہیں بلکہ ہمارے آس پاس کی دنیا سے اخذ کیے گئے ہیں۔ کامیاب افسانہ وہی ہے جس میں کردار حقیقی انسانوں جیسے معلوم ہوں۔ ان کے افسانوی کردار موجودہ سماج کی نمائندگی کرتے ہیں اور ہماری اور آپ کی زندگی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں چاہے وہ ''سرد جنگ'' کے ناصر اور شاہینہ ہوں ''ایک خواہش اور'' کے عظیم اور عروسہ، ''عذاب'' کا نوشیر خان، ''ودیا نگر کی مسجد'' کا بابو رام کنور یا پھر ''کسی سے کہنا نہیں'' کی ہریجن عورت۔ بے شک یہ کردار افسانوی دنیا میں شاہ کار کہلانے کا حق نہیں رکھتے۔ شین مظفر پوری نے انھیں تراش خراش کر شاہکار بنانے کی کوشش بھی نہیں کی، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ:

> ''افسانوں میں کردار نگاری مقصد نہیں ذریعہ ہے۔ فن کار اپنے بنیادی خیال کی وضاحت کے لیے ان کو ذریعہ بناتا ہے۔''

(افسانہ میں روایت اور تجربے، نقوش کا افسانہ، ص-447)

یہ انسان عجیب مرکب وجود کا حامل ہے۔ اس میں ایک جانب بڑی بلندیاں ہیں، وہ بلندیاں جو اسے ملائکہ کا ہم پلہ ہی نہیں مسجود بھی بناتی ہیں۔ دوسری طرف اس میں ایسی پستیاں ہیں کہ یہ خالص حیوانات کی سطح پر گر جاتا ہے۔ خیر و شیر کی عواطف و میلانات، بیک وقت ہمیں اپنے باطن میں محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے اندر نیکی، بھلائی، علو ہمت اور کردار کی بلندی کی طرف رجحان بھی موجود ہے۔ دوسری طرف پستی کی جانب میلان بھی خود ہمارے اندر موجود ہے۔ اسے ہم کشمکش خیر و شر سے تعبیر کرتے ہیں، یہی کشمکش خیر و شر شین مظفر پوری کے تمام فکشن کا موضوع ہے اور ان کے موضوع کی وضاحت کا ذریعہ ہے۔

ان کے تمام کردار دنیاوی بشر ہیں، نہ فرشتہ نہ ہی شیطان۔ ان میں جذباتی و عملی کمزوریاں بھی ہیں لیکن احساس ندامت اور ضمیر کی پکار بھی موجود ہے۔ گویا ان کے کردار سپاٹ (Flat) نہیں بلکہ مکمل (Roonal) ہیں۔ ان کے اندر اپنے دور کی زندگی کی سرگرمیوں کو پیش کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ المختصر ان کے افسانوی کردار اردو ادب میں شاہکار نہیں لیکن یادگار ضرور ہیں۔ ان کے فکشن کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ کردار بناوٹی نہیں حقیقی ہیں اور افسانہ نگار کے پختہ شعور کا بین ثبوت ہیں۔

□□□

Dr.Sufia Shireen
34, Abdul Halim Lane(4th Floor)
Near Doctor Lane Post Office
Kolkata - 700 016 (West Bengal)
Mobile : 9748904329

خواجہ کوثر حیات

اسلم مرزا کی منصفانہ تحقیق و تالیف

اردو زبان میں تخلیق، تنقید، تحقیق و تالیف چار بنیادی عناصر ہیں جن سے اردو تہذیب وتمدن آباد ہے۔ ان ستونوں کا یکساں بار اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ خالق کائنات بعض کو اس کی قدرت عطا فرما دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک نام اسلم مرزا کا بھی ہے۔ اسلم مرزا بیک وقت وکیل، شاعر، ادیب، تاریخ داں، محقق، مترجم، نقاد اور مبصر ہیں۔ آپ کے فنی محاسن و محاکات کے پیش نظر شاتا واہنا یونیورسٹی کریم نگر سے سیدہ فاطمہ النساء اسماء نے ''اسلم مرزا حیات، شخصیت اور فن'' پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ نیز ادب کے قد آور ایوارڈ مہاراشٹر اسٹیٹ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ہیں۔ میرے لیے اسلم مرزا صاحب کی شخصیت کو لفظوں میں قید کرنا مشکل امر ہے۔ یہ شعر یقیناً اسلم مرزا صاحب کی شخصیت کی ترجمانی کے لیے صادق آتا ہے۔

فِکر جس کی ہو روشن، تخیل ہو حسین
بیش قیمت وہ گوہر سے کچھ کم نہیں

اسلم مرزا نے بیک وقت کئی میدانوں میں کام کیا ہے۔ انھوں نے شاعری بھی کی اس کی مختلف اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی۔ نثر میں تحقیق کے جوہر دکھائے۔ آپ کی تحقیق کا پہلا شاہکار آئینہ معنی نما ہے۔ موصوف نے تحقیق میں تخلیقیت کا عنصر پیدا کر کے اپنی ایک الگ پہچان بنائی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ انھوں نے تمل شاعر 'کے۔ سچیتا نند' کی شاعری کو 'ہم جزیروں میں رہتے ہیں' اور 'لکنت' کے نام سے ان 2 / اردو کتابوں میں منتقل کیا ہے۔

اسلم مرزا نے تمل تراجم کے بعد یک لخت پشتو میں طبع آزمائی کی۔ پشتو کے عوامی نغموں سے اردو زبان و ادب کو معطر کیا۔ اس کے بعد مراٹھی سے مور پنکھ، پیاری انو، فساد اور دیگر نظمیں اردو کے قالب میں ڈھال کر مٹی کا قرض ادا کیا۔ سراج اورنگ آبادی کی 103 / غزلوں کو ہندی میں منتقل کر کے ہندی ادب کو سراج آشنا کر دیا ہے۔ تحقیق و تاریخ میں آئینہ معنی نما عبدالولی عزلت سورتی کے مضامین کا مجموعہ ہے اور 'گلدستہ خوش باش' ولی کے اعتراف اور تحسین پر مشتمل ہے۔ تاریخی موضوعات پر سلاطین دکن کے عہد میں شادیاں نظام شاہی توپ ساز محمد بن حسن رومی خان جیسے موضوعات پر توپ کے مقابلے میں قلم اٹھا کر اپنی جرأت رندانہ کا ثبوت دیا ہے۔ اسی کے ساتھ 'دکن کی پیش رو غزلیں' دکن میں اردو کی ابتدا۔ ارتقا اور ترویج کی دستاویزی تاریخی کتاب جو آپ کا خوبصورت شاہکار ہے۔

ڈاکٹر سحر سعیدی اپنی کتاب 'خاصان خوش خیال' میں مضمون 'اسلم

مرزا : وسیع الاطراف فنکار‘ (صفحہ نمبر 228) میں رقمطراز ہیں؛

’’خجستہ بنیاد اورنگ آباد کے بنیاد گزاروں اور اس شہر کو سجانے سنوارنے والوں میں جہاں تین نام نمایاں نظر آتے ہیں، ملک عنبر، اورنگ زیب عالمگیر اور ڈاکٹر رفیق زکریا وہیں اس تاریخی اور عالمی شہرت یافتہ شہر کی ادبی تاریخ کو جلا بخشنے والوں میں مولوی عبدالحق، شیخ چاند اور ڈاکٹر عصمت جاوید کے بعد اسلم مرزا کا نام منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔‘‘

محترم سحر سعیدی کے ان کلمات کی سب سے بہترین مثال زیر تبصرہ کتاب ’دکن دیس کی پیش روغزلیں‘ ہیں۔

اردو ادب نامہ میں زبان اردو کا ذکر ہو اور شعر و سخن میں دکن سے کامیاب مساعی ناقابل فراموش ہے۔ ولی اور سراج سے منسوب سرزمین دکن ابتدا سے ہی اردو شاعری کی علمبردار رہیں۔ اپنی تہذیب وتمدن کے اعتبار سے سولہویں سے اٹھارہویں صدی میں بھی آج کی ہی طرح زرخیز رہیں۔ اس کا دستاویزی ثبوت اسلم مرزا کی تاریخی اہمیت کی حامل کتاب دکن دیس کی پیش روغزلیں ہیں۔ جس میں انھوں نے سولھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک کے تقریباً 117 شعرا کے مختصر تعارف اور ان کے منتخب کلام کو منصفانہ تحقیق کے ساتھ پیش کیا ہے۔

انتساب عالمی، جنوری۔ مارچ 2017 کے شمارے میں تبصرہ کرتے ہوئے محمد متین ندوی ’دکن دیس کی پیش روغزلوں‘ کے متعلق رقمطراز ہیں؛

’’اسلم مرزا صاحب نے تحقیق کے میدان میں وہ جوہر دکھائے ہیں کہ بڑے بڑوں نے ان کی تحقیقی تصنیفات کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ یہ ان موضوعات کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کرتے ہیں، جن پر لکھنے کی عام طور پر اہل قلم ہمت نہیں کر پاتے اور حق تو یہ ہے کہ اسلم مرزا صاحب تحقیق کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ ’دکن دیس کی پیش روغزلیں‘ بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے۔‘‘

کتاب کی اشاعت کے متعلق محمد متین ندوی مزید لکھتے ہیں کہ:

’’اسے ایک فرض کفایہ کی ادائیگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ کتاب دکنی شاعری کے تعلق سے مرجع اور ماخذ کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنا مقام حاصل کر لے گی۔‘‘

ادب کے نامور سہ ماہی رسالہ ’اسباق‘ کے لیے شروع کی گئی اسلم مرزا کی چھوٹی سی کاوش جو چند شعرا کے کوائف اور غزلوں کے احاطہ سے شروع ہوئی۔ وقت گذرتے یہ عرق ریزی اور توجہ سو سے زائد قدیم شعرا کے کلام کو منصوبہ بندی سے محفوظ کرنے میں کامیاب ہوئی۔ دکن دیش کی پیش روغزلوں کی شکل میں آج ہم تشنگان ادب کی ذہنی آبیاری کا بہترین ذریعہ اور اپنے علاقہ کی ادبی رعونیت کی مثال بن کر کتابی شکل میں موجود ہے۔

چونکہ اردو غزل میں دکن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلم مرزا دکن کی شاعری کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں کہ؛

’’دکن کے ان تمام شعراء کے کلام کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں ارضیت، مقامیت، ہندو اساطیر سے گہری دلچسپی، ہندوستانی تہذیب وتمدن کی روشن روایات کی بوقلمونی، حسن وعشق کی نیرنگیاں اور ہجر و وصال کی دل گداز کیفیات کا بحر بیکراں موجیں مار رہا ہے۔‘‘

اس کتاب میں آپ نے مشتاق بیدری، ملا خیالی، خواجہ محمد دہدار فانی، شیرازی، ملا وجہی، محمد قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، عطائی، قدیمی، سراج اورنگ آبادی، سامی اورنگ آبادی غرض سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے درمیان 117 شعرا کے تذکرے شامل کیے ہیں۔

کتاب میں شعرا کی فہرست ہی آپ کے عمیق مطالعہ اور تاریخ شناسی کی صلاحیت کی سند ہے۔ تاریخ ادب سے آپ کی دلچسپی آپ کو حیدرآباد ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ سالار جنگ (شعبہ مخطوطات) میں محفوظ دکنی شعراء کے دواوین تک لے گئی۔ اسلم مرزا صاحب نے اس کتاب میں بیجاپور اور گولکنڈہ کے ساتھ آصف جاہی عہد کے شعرا کو بھی شامل کیا ہے۔ معروف نقاد ومحقق شمس الرحمن فاروقی ’دکن دیش کی پیش روغزلیں‘ کے متعلق اسلم مرزا کو لکھے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں؛

’’آپ کی یہ کتاب ایک بڑی کمی کو پورا کرنے کی سنجیدہ کوشش ہے۔ ہمارے یہاں شمالی ہند میں تو دکنی کو نظرانداز کرنے کی رسم پرانی ہے، افسوس یہ ہے کہ اب میں دکن والوں میں بھی عدم توجہ دیکھتا ہوں۔ آپ کی اس کتاب کے ذریعہ بہت سے نامور اور بہت سے کم نامور شعرا سے ملاقات ہوتی ہے۔ آپ نے ہر اندراج کے بعد فرہنگ بھی بنائی ہے جس سے کلام کو پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔‘‘

عظیم راہی معروف افسانچہ نگار اسلم مرزا کے تحقیقی کام ’دکن دیس کی پیش روغزلیں‘ کے متعلق رقمطراز ہیں؛

’’تحقیق جوجگر کاری اور پتہ ماری کا نام ہے، اس کی اصل پروہ

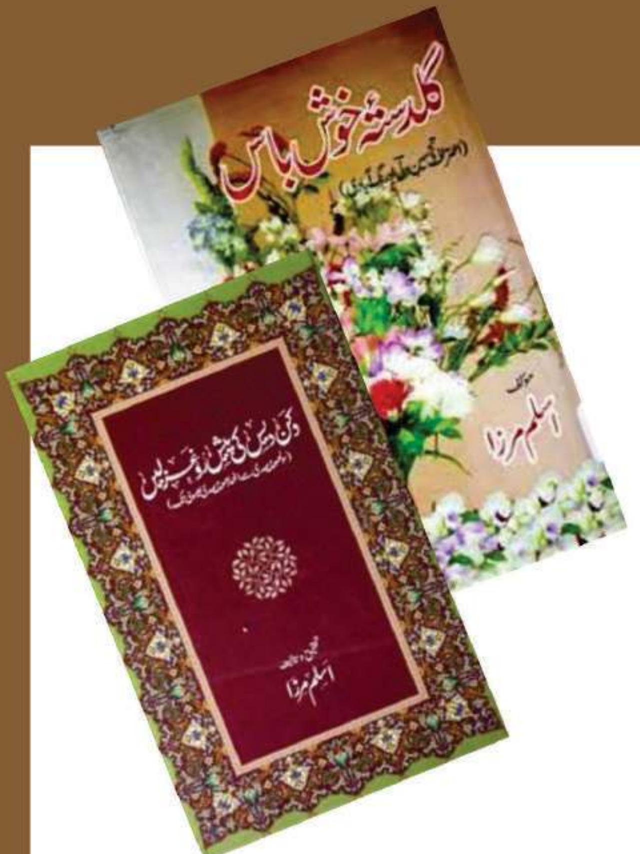

پورے اترتے ہیں اوران کی تنقید میں صحت مند رجحان بطور خاص نظر آتا ہے اور تحقیق میں وسیع النظر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ وسیع القلب واقع ہوئے ہیں۔''

(بحوالہ 'نقدونظر کے درمیان' صفحہ نمبر 23)

قارئین کی دلچسپی اور آسانی کے پیش نظر اسلم مرزا نے غزلوں کے نیچے قدیم دکنی اور غیر معروف الفاظ کے معنی بھی درج کردیے ہیں۔ بقول خان شمیم؛ ''یہ کتاب دبستان دکن کا اعتراف ہی نہیں اعتبار بھی ہے۔''

کتاب میں مشتاق بیدری کی غزلوں کے لیے ڈاکٹر محمد جمال شریف کے لکھے الفاظوں کو اسلم مرزا صاحب نے کوائف میں پیش کیا ہے کہ؛'' قدامت کے باوجود اردو شاعری کے بہترین نمونے اور اردو شعرو ادب کی تاریخ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔''

اسی طرح بہمنی دور کے شہرت یافتہ شاعر لطفی بیدری کا بھی کتاب میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ لطفی کے غزل کے اشعار کو ریختی کا اولین نمونہ کہا جاتا ہے۔ 'دکن دیش کی پیش روغزلیں' پر خان شمیم خان مزید لکھتے ہیں کہ؛

''ہم ورق گردانی کرتے رہے، ہر صفحہ پر حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے لگاتے رہے کہ سولھویں صدی سے اٹھارویں صدی عیسویں کے طویل عرصہ میں اس شہر میں سینکڑوں شعراء نے اس شہر خجستہ بنیاد کی نہ صرف آبرو رکھی بلکہ اسے بام عروج تک کا پہنچادیا۔''

(شہرنامہ، روزنامہ ایشیا ایکسپریس، اورنگ آباد 6 دسمبر 2016)

اس کتاب میں ولی اورنگ آبادی کی شاگردی حاصل کرنے والے عمر اورنگ آبادی کا تعارف بھی شامل ہے۔ نصف دسویں صدی اور گیارہویں صدی ہجری کے شاعر جن کی شاعری کا حوالہ انجمن ترقی اردو ادب، پاکستان کی قلمی بیاض میں محفوظ ہے۔ ایسی اہم اور مدلل معلومات کا احاطہ کرتے ہوئے اسلم مرزا نے اپنے قلم کے جوہر سے تاریخ کے باب میں مسلسل اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر منظر اعجاز 'دکن دیس کی پیش روغزلیں' کے بارے میں اردو بک ریویو میں تبصرہ کرتے ہیں کہ؛

''دکن دیس کی پیش روغزلیں، دکنی غزل گویوں کے سلسلے میں ہماری معلومات میں وسعت اور اضافے کا سبب بنتی ہے۔''

سرزمین دکن کے شعری پس منظر کو پیش کرتی ہوئی 2016 کی اہم دستاویزی کتاب 'دکن دیس کی پیش روغزلیں' جس میں قارئین کے لیے تاریخ کی جھلکیاں، شعروسخن کے جمالیاتی رنگوں کا امتزاج، تحقیقاتی معارف کی تنویریں، بصائر وعبر کی کرنیں جا بجا ملتی ہیں۔ فکر ونظر کی روشنی کا سامان مہیا کرنے والے 117 رقدیم شعرا کے کلام کی رعنایاں یقیناً ارباب علم کو دعوت مطالعہ دے رہی ہیں۔ امید کرتی ہوں اہل علم ودانش ضرور اس سے استفادہ کریں گے۔ اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے میں بارگاہ تعالی میں علم کا منبع ثابت ہونے والے جناب اسم مرزا صاحب کے لیے دعا گو ہوں؛

یہ چراغِ آگہی صدیوں یونہی جلتا رہے
کارخانہ ذہن سازی کا یوں ہی چلتا رہے
اس صدف سے موتیوں کی بارشیں ہوتی رہے
اس قمر سے ظلمتوں میں تابشیں ہوتی رہے
خوشبوؤں کے بانٹنے کا سلسلہ دائم رہے
بحر علم و فن کی یہ دریا دلی قائم رہے

□□□

Mrs. Khwaja Kauser Hayat
Syed Athar Ahmed
Flate No.8,Safa Complex,
Kala Darwaza
Aurangabad-431001 (M.S)
Mob: 9373193908, 8446731081

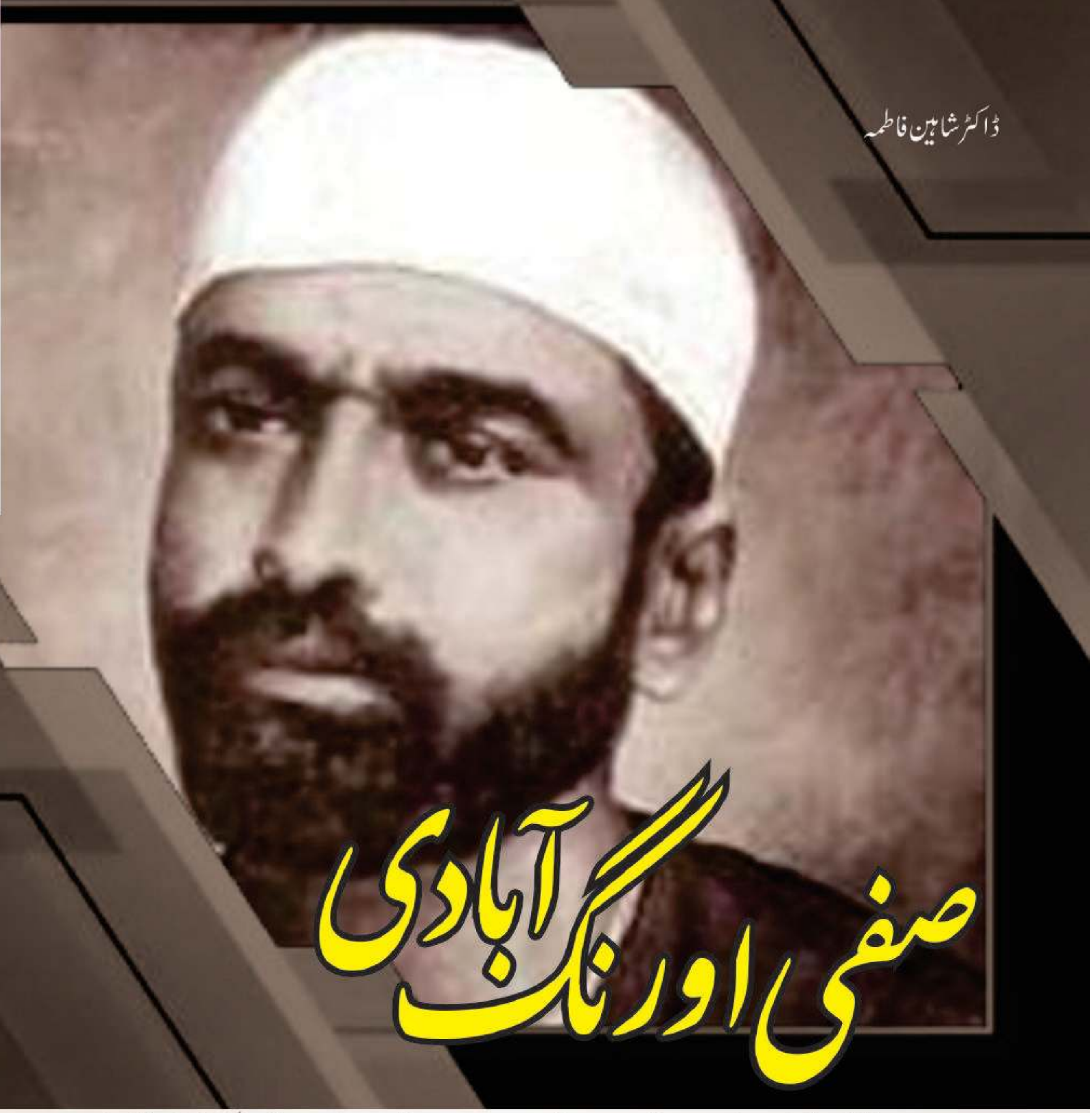

صفی اورنگ آبادی

ڈاکٹر شاہین فاطمہ

میر بہبود علی صفی اورنگ آبادی کے نام سے مشہور ہیں۔ 3رفروری 1891 کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ کم عمری ہی میں اپنے والدین کے ساتھ حیدرآباد چلے گئے اور وہیں تمام عمر بسر کی۔ 21/مارچ 1954 میں وفات پائی۔ ان کی تصانیف میں پراگندہ کے علاوہ ان کے شاگردوں کے مرتب کردہ کچھ انتخابات بھی شامل ہیں۔

صفی اورنگ آبادی داغ اسکول کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے یہاں زبان کی سلاست محاورے اور روزمرہ کا استعمال، آسان طرزِ ادا اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے مجموعی تجربات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا بنیادی موضوع تو حُسن وعشق ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے آس پاس کی زندگی پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔

انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر تجربوں کو عمومی تجربے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ صفی کی شاعری میں نہ فلسفہ ملتا ہے نہ کتابی باتیں، اُن کے یہاں حُسن وعشق کا بھی روایتی اور گھسا پٹا تصور نہیں ملتا۔ وہ ہر اُس واقعے، سانحے یا مشاہدے کو اپنا موضوعِ سخن بناتے ہیں جس سے اُن کا سابقہ پڑا ہو، اور جسے انھوں نے اپنی روح ودل کی گہرائیوں سے محسوس کیا ہو۔

صفی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے یا احساس کو انتہائی آسان اور سادہ زبان میں بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ زبان کی سلاست اور محاورے کا استعمال انھوں نے داغ اور اُن کے

شاگردوں سے سیکھا لیکن بہت سے شاگردانِ داغ کے برخلاف انھوں نے سنی سنائی اردو غزل میں بطور فیشن رائج ہونے والی باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے شاعری کو اظہارِ ذات اور انسانی رشتوں کی گہرائیوں کا عکاس بنایا۔

گو وہ تقریباً سات سال کی عمر ہی میں حیدر آباد چلے گئے تھے اور اپنی پوری زندگی وہیں گزاری لیکن سرزمین اورنگ آباد سے ان کی وابستگی ہمیشہ باقی رہی اور آخری وقت تک اپنے نام کے ساتھ اورنگ آباد کا لاحقہ لگائے رہے۔ ویسے بھی ریاست کی لسانی تقسیم تک حیدرآباد اور اورنگ آباد کے رشتے اتنے قریبی رہے کہ اُن میں دوری کا احساس تک نہیں ہوتا۔

صفی کی شاعری میں نہ صرف دکن کی روایت صحت مندانہ عناصر اپنی نمود کرتے ہیں بلکہ ترقی یافتہ اردو زبان کی سلاست، سادگی اور شیرینی میں بھی اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہے۔ صفی قلندر صفت شاعر تھا اور وہ دنیا طلبی، مال و دولت اور غرور سے بے نیاز اپنی دنیا میں مست رہتے۔ انھوں نے کبھی سستی شہرت کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کے باوجود ان کے کمالِ فن نے غیر معمولی شہرت وعزت حاصل کی۔ آج بھی حیدرآباد میں صفی کے شاگردوں کی تعداد کسی بھی استاد کے شاگردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔

صفی کی شاعری کا مزاج تصوف کے اثر کی وجہ سے بے نیاز اور قلندرانہ ہے لیکن انھیں اپنے ذات کا اسیر شاعر نہیں کہا جاسکتا۔ وہ اپنی عزلت پسندی اور بے نیازی کے باوجود زندگی سے پوری طرح وابستہ تھے اور اُس کے ہر رنگ کو دیکھا پرکھا اور محسوس کیا اور اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اُن کی شاعری میں قناعت پسندی، عقیدے کی پختگی اور دنیا پرستوں سے بیزاری غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

آبرو رکھ کر نہ کوئی اہلِ دولت سے ملے
ایک ٹکڑا لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

غیروں سے التجا کی ضرورت نہیں صفی
گھر بیٹھے بھیج دیتے ہیں اللہ میاں مجھے

صفی کی خودداری تو انھیں خدا کے سامنے بھی دست دراز کرنے سے روکتی نظر آتی ہے۔

خدا سے دولتِ دنیا صفی میں کیا مانگوں
غضب ہوا جو میرا کام بے دعا نہ ہوا

صفی اورنگ آبادی کو اُس کمال کی قدردانی کا پورا پورا احساس تھا اور وہ کئی جگہ اشاروں اشاروں میں اس کا اظہار کرتے تھے لیکن اُن کے یہاں تعلّی قطعی نظر نہیں آتی بلکہ وہ بڑی سادگی سے اپنے اور اپنے فن کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے ماننے والے اور چاہنے والوں نے ہمیشہ انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ صفی کی زندگی پھولوں کی سیج نہیں تھی۔ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو لے کر تنگی و ترسیوں سے زندگی گزاری لیکن وہ کہیں بھی کسی کے سامنے دست طلب دراز کرتے نظر نہیں آتے۔ البتہ قدرداں خود اُن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور صفی اُن کی قدردانی کی قدر کرتے۔

خلق تہذیب میں خدا رکھے
ہے غنیمت بہت دکن کے لوگ

صفی کو اپنے کمالِ فن کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ شاعری میں سادگی، صفائی اور حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک شاعری میں غریب الفاظ اور نامانوس لغات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں دکن کی اردو روایت، اس کی فصاحت، بلاغت، لب و لہجے اور محاورے پر فخر تھا۔

نہ جانے ہند والے کون ہے
وہ بولتے کیا ہے صفی
ہم دکنیوں کی صاف اردو
اِس کو کہتے ہیں

سقوطِ حیدر آباد سے پہلے تک شمالی ہندوستان کو صرف ہندوستان کہا جاتا تھا اور دکن کی الگ شناخت پر اصرار کیا جاتا تھا۔

فانی دکن میں آگے یہ عقدہ کھلا
کہ ہم ہندوستاں میں رہتے ہیں
ہندوستاں سے دور

صفی اورنگ آبادی کی شاعری میں گفتگو کا سا انداز ملتا ہے۔ اُن کے شعر مکالمات نہ سہی لیکن پورا انداز بات چیت کا سا ہوتا ہے۔ اُن کی سادہ بیانی ان کی اس بات چیت کو دلچسپ اور پُر اثر بناتی ہے۔

خواب میں تم کو کس نے روکا ہے
آنے جانے کے ہیں ہزار طریق

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا
بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

صفی کے اشعار معنوی اعتبار سے اُتنے سادہ نہیں ہوتے جتنے بظاہر نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں ابہام کا عمل دخل قطعی نہیں لیکن تہہ داری

موجود ہے۔مثلاً۔

زمانے کی شکایت کررہا ہوں
مجھے اُن کا چلن یاد آگیا ہے

دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی
دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا

اور روئے اُس کی بدنصیبی کو
ڈھونڈنے پر جسے خدا نہ ملا

یہ اوراس قسم کے کئی اشعار جہاں صفی کے شاعرانہ احساس اوراُن کی صفائی زبان کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہیں ان کی قادرالکلامی اور زبان و بیان کی پوری مہارت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔موضوعات کی حدتک صفی اجتہادنہیں کرتے۔ وہ تقریباً انہی موضوعات کر چھوتے ہیں جو اردو غزل کے عام موضوعات ہیں لیکن صفی کی خوبی یہ ہے کہ انھیں روزمرہ اور محاورے کی مدد سے زیادہ رواں، شیریں اورصاف بنالیتے ہیں۔

صفی کے اشعار پڑھتے ہوئے اکثر اردو کے اساتذہ کے اشعار یاد آتے ہیں لیکن ہم ایسے اشعار کو بھی محض نقالی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں صفی اپنا رنگ سخن شامل کردیتے ہیں اور بڑے صاف اور آسان انداز میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ صفی کو متن سے متن تیار کرنے میں مہارت حاصل ہے۔وہ پرانے اشعار میں بھی کوئی ایک آدھ پہلوایسا شامل کرلیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اشعار صفی کے رنگ کے نمائندہ بن جاتے ہیں۔عام طور پر یہ تبدیلی زبان وبیان کی حدتک محدود رہے گی۔مثلاً۔

دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی
دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا

پڑھتے وقت مشہور فارسی محاورہ ''دیوانہ بکارِ خوش ہوشیار است'' اس طرح میراوردرد کے کچھ اشعار ذہن میں گونجنے لگے ہیں۔

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستوں
یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا

کے ساتھ طبیعت ہی تو ہے جدھر آ گئی، جیسے مصرعے یاد آتے ہیں۔صفی معنی اور طرزِ اظہار کے اعتبار سے وہاں منفرد نظر آتے ہیں۔ جہاں وہ قناعت کی باتیں کرتے ہیں یا اپنے قلندرانہ روش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے سنتے ہیں کب دے گا
جب آنکھیں لگ گئی چھت سے تو کیا امید چھپر سے

یہ تکیہ اور بستر ٹھاٹ ہے سب اہل دنیا کے
جنھیں اس پر ہے تکیہ ان کو تکیہ ہے نہ بستر ہے

صفی کی شاعری کی سب سے بڑی قوت محاوروں کے برمحل استعمال اور روزمرہ کی زبان میں اپنی بات کہنے کے ہنر میں پوشیدہ ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے اکثر اشعار ضرب المثل بن جانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اچھی صورت نہ دیکھ سیرت دیکھ
سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

جھک کے ملنا بھی ایک کرامت ہے
جس سے دنیا مرید ہوتی ہے

ہم تم جو مل کر بیٹھے تو کیوں انگلیاں اٹھیں
کیا مل کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

صفی کا شاید ہی کوئی ایسا شعر ملے جس میں کوئی محاورہ نہ باندھا گیا ہو، اور داغ اسکول میں محاورے کو جو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اُس سے سبھی واقف ہیں۔صفی کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کے سیکڑوں محاوروں کو اپنی شاعری کے ذریعے محفوظ کردیا ہے۔ اسی طرح روزمرہ کا استعمال بھی صفی کو ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ دوسرے شعرا بھی وقتاً فوقتاً محاورے اور روزمرہ کا استعمال کرتے رہے لیکن صفی اُن شعرا میں ہیں جنھوں نے کوئی شعر محاورے یا روزمرہ کے بغیر کہا ہو۔اُن کا ہر شعر گویا ایک نئے محاورے یا زبان کے ایک نئے پہلو سے روشناس کرواتا ہے اور یہی خصوصیات صفی کا نام اور کام باقی رکھنے کے لیے کافی ہے۔

□□□

Dr. Shaheen Fatma
President Teacher
Muncipal Corporation Urdu
School No. 1,
Kararpura
Aurangabad-431002 (M.S)
Mob: 9420864777

ڈاکٹر اسماء بدر

موتی لال ساقی
شخصیت اور فن

کہتے ہیں خوش نصیب ہے وہ قوم جو کسی ہنر مند شاعر، فلسفی اور ادیب کو جنم دے اور بد نصیب وہ قوم ہے جو اپنے دور کے شعرا وادبا کو مناسب مقام عطا کرنے سے قاصر ہو کر انھیں حقیر زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہے۔ حالاں کہ باشعور تہذیبی اقدار میں ادبی قدر ایک ادیب کو شہرت وعظمت کے ساتھ ساتھ دولت سے بھی نواز سکتی ہے۔ ہر چند کہ کسی بھی زبان کے ادیب یا شاعر کا منظوم سرمایہ ہی اس کی فنکاری اور تخلیقی ہنر مندیوں کا غماز ہوتا ہے۔ اس خیال کو ملحوظ نظر رکھ کر جب ہم کشمیری ادب کے کل ہما سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو تشفی اور تسلی بخش نتائج سامنے آتے ہیں۔ جس میں اس کے اظہارِ حقیقت سے متعلق قطعی مبالغہ آرائی کا دخل نہیں۔

انیسویں صدی کے اوائل اور بیسویں صدی کے اواخر تک کئی قد آور تخلیق کار اور شعراء منظرِ عام پر آئے۔ رسول میر سے صمد میر تک اور عبدالاحد آزاد سے موتی لال ساقی تک سینکڑوں ادبی معجزات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان تمام صاحبِ علم حضرات نے اگرچہ آسودہ حال زندگی پائی تھی لیکن اس کے باوجود بھی انھوں نے خستہ حال زندگی کو ہی ترجیح دی۔ کہتے ہیں

''پیغمبری جزو یست از پیغمبری''

کشمیری ادب میں ایسے معتبر تخلیق کاروں اور باکمال فن کاروں کی کوئی کمی نہیں ہے جن کا کلام فنی اور لسانی اعتبار سے صاف وشستہ نہ ہو۔ یہ سب صحت مند زبان و بیان کا آیئنہ دار ہے، جو خوش بیانی اور تیز بیانی کی ہی دین ہے۔ ان تمام حضرات کا کلام مانندِ شمع روشن اور آبِ رواں کی طرح ہے۔ ان میں مرحوم موتی لال ساقی جو ایک منفرد لب و لہجے کے حامل تھے، کا نام بھی شامل ہے، جن کے اسلوبِ بیان کی ندرت اور جدت انتہا کو چھو رہی ہے۔ ساقی صاحب کے فکری یا تخلیقی و تخیلی کائنات میں کسی غیر کی آمیزش کی بازگشت دور دور تک ناپید ہے۔ ایسے صاحبِ طرز اور اعلیٰ پایہ کے ادیب وشاعر کو اپنے منفرد شگفتۂ فکر اور پیرائے بیان کی بدولت اپنے حلقہ ارباب علم

وادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ اپنی آخری سانس تک اس طرہٗ امتیاز کے بجاطور پر مستحق نہ رہے کہ'' بجھے ہوئے چراغ کو آفتاب کی روشنی عطا کرنے سے کیا فائدہ''۔

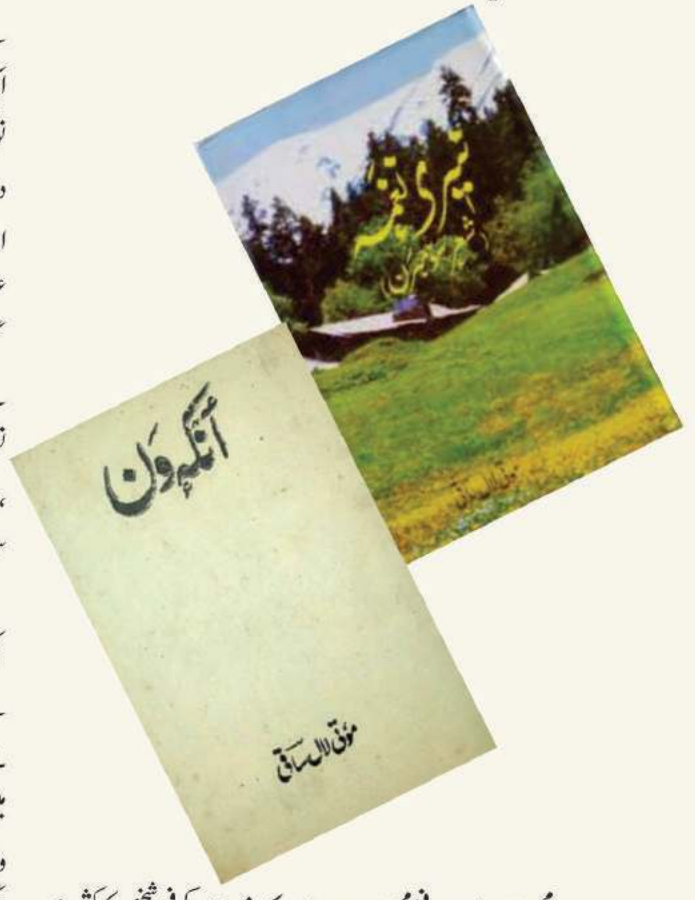

مجھے اس بات پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ مجھ جیسے کم فہم شخص کو کشمیری زبان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے والے اعلیٰ پایہ کے ادیب وشاعر موتی لال ساقی، ان کی شخصیت اور کشمیری زبان کو ان کی دین سے متعلق اظہارِ خیال کرنے کا موقعہ ملا۔ میرے اندازے کے مطابق لمبی چوڑی پیشانی، بھورے رنگ کی چمکیلی آنکھیں، درمیانی قد وقامت، سفید اور گورے رنگ کے بال، راز دان موتی لال ساقی اکثر وبیشتر کھادی کی قمیض واسکٹ، پیروں میں خوبصورت چپل پہنے، پتلون یا پتلون نما شلوار زیبِ تن کیے ادبی محفلوں اور سیمناروں میں جاتے تھے۔ جوش جوانی میں بھی اپنے دوستوں کا خیر خواہ بن کر اکثر وبیشتر بائیں کاندھے پہ آویزاں کھادی کا بستہ لیے، سنجیدہ گفتگو کے مالک ایک خوش شکیل شخصیت کی صورت سامنے آتی ہے۔

پدم شری موتی لال ساقی بیسویں صدی کے وسط میں بنا کسی تردید کے بعض ایسے شعرا میں شمار ہونے لگے جو تخلیقی عمل میں پیکر اور نئی علامتوں کی تقلید کیے بغیر مشہور ہوئے۔ ساقی صاحب اپنی ذاتی اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت علم وادب کے بامِ عروج کو پہنچ گئے۔ وہ ایک پُر مغز نکتہ دان کے ساتھ ساتھ اسلوبِ بیان میں بھی ید طولیٰ تھے۔ اس طرح اُن کا شمار کشمیری زبان وادب کے اُن دانشوروں میں ایک ممتاز مفکر کی حیثیت سے ہونے لگا جو کشمیری زبان وادب کے بڑے پایہ کے موجدین تھے جو ایک طرف مولانا رومی کے راز دان تھے اور دوسری طرف شیخ نور الدین نورانی کے ایمان پروری کے قائل، ایک جانب شیرازی کے شیدائی اور دوسری جانب علامہ اقبال کے قدر دان اور ساتھ ہی جو مھجور کے کلام کی نرمی اور نزاکت کو پہچاننے میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔ جسے مختلف مذاہب اور عقیدوں کی مکمل جانکاری تھی۔ جو کشمیر کے قدیم وجدید تواریخ کا ایک قیمتی گنجینہ تصور کیا جانے لگا۔ ساقی صاحب کا تحقیقی کام اس لحاظ سے قابلِ داد ہے کہ انھوں نے کشمیریوں کے سامنے موجودہ سیاسی، سماجی اور جغرافیائی تصور کو اس طرح پیش کیا جیسے کسی ماہر جغرافیہ کو بے شمار ممالک کے پہاڑ، وادیوں اور حال واحوال سے متعلق بھرپور واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا دلچسپ سفرنامہ'' قزاکستان'' قابلِ ذکر ہے۔

ساقی صاحب حقیقی معنوں میں کشمیریت کے نبض شناس تھے۔ جس کی بہترین مثال کلہن کی راج ترنگی یا جان کیٹس کے خطوط کا کشمیری ترجمہ ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال کی نظموں کو بطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی حصے میں ان کا'' اگر نیب'' صحیح معنوں میں انھیں بلند پایہ مورخین میں شمار کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ساقی صاحب کی ذہانت اور اس قسم کی واقفیت نے ان کی شخصیت کو ایک مخصوص چال ڈھال سے نوازا جس کی رنگا رنگی ہر ایک کے یہاں عیاں ہے۔

ساقی صاحب شاعری کے فنّی لوازمات کے ساتھ ساتھ نئے تجربات کے سہارے پیکر تراشی بھی کرتے رہے، الفاظ کو نئے انداز سے پیش کر کے ان میں نئی معنویت عطا کرنا، نئی نئی علامتوں کو استعمال میں لا کر انھوں نے کشمیری شعر وادب کی آبیاری کی اور اپنا ایک خاص اور منفرد مقام حاصل کیا جس پر ہمیں بجا طور پر ناز وفخر ہے

تمس زُلفن یہ خم روزیانہ روزیا
غنیمت شامِ غم روزیانہ روزیا

اسی نوع کے قابلِ تحسین شعری نمونے ایک قلم کار کو موزون معنویت عطا کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں جو ایثار، نزاکت اور نغمگی پائی جاتی ہے وہ واقعی ان کے بے باک قلم کی خوش حالی اور روانی کا بین ثبوت ہے۔ ساقی صاحب جہاں انسانیت اور خلوص کا مجسمہ تھے وہیں وہ ہمارے تمام ادب کے لیے ایک خوش بخت وباصلاحیت اور محبّ وحسین شاعر تھے

غم دِتم گُلہِ میٹھی سمین نالہِ موت کورمکھ رُچھم
توتہِ چھس گاشس دواں آلو بہِ صچھِ آشہِ تےَ

ساقی صاحب کا ظاہری رویہ ان کی داخلیت کا ہم نوا تھا۔ وہ ایک مستقل مزاج شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے کبھی بھی کسی کی خوشامدی کے لیے اپنا رنگ نہیں بدلا۔ وہ ہر ایک حقیقت کا اعتراف نڈرتا اور بیبا کی سے کرتے تھے۔ جو کچھ میں نے ان کے ساتھ بتائے ہوئے دس سالوں میں اخذ کیا۔ وہ بھرپور استدلالی انداز میں اپنے دانشوارانہ تصوارت پیش کرتے اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مختلف سیاسی، ادبی، سماجی یا گھریلو معاملات بھی اُن کی بحث میں شامل رہتے تھے۔ بحیثیت تخلیلی شاعر جو کچھ بھی انھوں نے تخلیق کیا وہ ہر اعتبار سے نرالا ہے یا کہ بحثیت نقاد جو کچھ اس ماہر زبان نے لفظوں کو عطا کیا وہ سب مدلل اور دلچسپ ہے۔ اگرچہ انھوں نے کم وبیش ہر ایک صنفِ ادب میں اپنے خیالات، تصورات اور تجربات کا اظہار کیا ہے لیکن جس صنفِ ادب نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا وہ صنفِ غزل ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کے مجموعہ جات میں ''مودری خاب'' ''انکہ ون''، ''گاشری''، ''من سر''، نیری نغمہ'' قابلِ فخر ہے۔ ان کے علاوہ لوک گیت کے پانچ حصے جس سے متعلق وہ بذاتِ خود کہتے ہیں کہ ''کہ میری زندگی کا حاصلِ مطالعہ لوک گیت سے ہی معرض وجود میں آیا۔ اسی طرح ''وژن''، ہند باتھ، مولو، منزلی باتھ، شری باتھ، پریژ، لڈی شاہ، ونہ ون تہ کھاندر، وغیرہ ہندی قومیت کی اساس کے بطور ہمیشہ محفوظ ہیں۔

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ''من سری گونماتھ'' کے علاوہ موتی لال ساقی نے کلچرل اکیڈمی کے ذریعے کئی سارے کلیات ترتیب دیے۔ جن میں کلیاتِ صمد میر، دو جلدوں پر مشتمل کلیاتِ پرمانند اور کلیاتِ شیخ العالم قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ تواریخ تحقیق اور ڈراما وغیرہ سے متعلق پُرمغز مقالات بھی تحریر کیے۔ بنا کسی دورائے یا شک وشبہ کے میں یہ بات نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کشمیری علم وادب میں نئی نئی راہیں تلاش کرنے والے اور زبان وبیان پہ کامل دسترس رکھنے والے کسی بھی صدی یا کہ موجودہ صدی کے شعرا وادبا کی جامع تاریخ رقم کرتے ہوئے کوئی بھی تنگ نظر تذکرہ نویس موتی لال ساقی کے نام کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے جس نے شائستہ ادبی روایت کو بڑی سنجیدگی سے آگے بڑھایا یا کہ اظہارِ حقیقت کو اپنے قلمی توانائی سے نئی راہوں کو ہمکنار کیا، جس نے اپنے شخصی مزاج اور سوچ کو اپنی تخلیقات میں جگہ دینے کی کامیاب کوشش کی، جس کے کلام میں لاکلام کی مخصوص انفرادیت موجزن ہے اور جس کی آواز نے غزلیہ لہجے میں ایک نئے انداز اور طرزِ ادا کو راہ دی۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بہارُک وق تہِ بیہ گوژھ جام آسن
ژوداہمہ زونہ ہُند گوژھ شام آسن
شبا کی نغمہ گسی آسن نٹین پیٹھ
مے گوژھ بیہ برنٹھ کنہِ گلفام آسُن

ساقی صاحب کا جمالیاتی ذوق اور مزید علم وادراک کی آرزو قدرت اور فطرت کی عطیہ ہے۔ ایسی شخصیت کی پہچان سماجی اقدار پر ایقان اور وفاداری ہے۔ جس طرح ایک ادیب یا کہ شاعر کسی تواریخی کردار کو اپنے منظوم میں پیش کرتا ہے۔

سحر سکتی کا شکار ہونا دانشوری کا مقدر ہے جس کی تمام تر منزلیں ساقیبا آسانی طے کرچکے تھے۔ وہ اپنے اردگرد کی آب وہوا سے متاثر ہوکر اپنے پُرکیف لمحات میں غرق ہوکر گفتار کی مستی پیدا کرتے رہے اور اپنے جذبات واحساسات کو گویائی عطا کرکے منظرِ عام پر لاتے رہے۔ جس کا مکمل احساس اس نظم میں دیکھنے کو ملتا ہے

ہنگ تہ منگہ ووتھ آولن وولیو ونب
زیر کی دژنس تہِ ما امی زانہہ تہِ وون
بال الراونی تہ بونِ ژوک پھرن
لوکھ چھکر نہ آئے وتھی زن چھانہ ڈونی

اپنی زندگی کے روزمرہ کے اُتار چڑھاؤ، دکھ ودرد، خوشی ومسرت، بُرا بھلا، چیخ وپکار، وغیرہ کو اس طور پر محسوس کرتے تھے جیسے وہ ان تمام نشیب وفراز سے بے خبر اور لاعلم ہوں۔ محض قومی روایت کو اپنی تخلیقات میں جگہ دینے کی بدولت آپ کا شمار ہنرمند اور مقبولِ عام شعرا میں ہوتا ہے۔

ایک زندہ قوم کی شان اور پہچان اس بات میں پوشیدہ ہے جو اپنے ماضی سے واقفیت، اپنے قدآور اساتذہ اور اپنے بزرگوں کی تعظیم سے رچی بسی ہو۔ ساقی صاحب بلاشبہ کشمیری ادب کے بلند اور اعلیٰ پایہ کے ادیب اور شاعر گردانے جاتے ہیں اور شاید ہی کشمیری ادب ایک لمبے عرصے تک ایک اور ساقی پیدا کرسکے گا۔ 21 مئی 1999 کو ساقی صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ☐☐☐

Dr. AsthmA Badar
Lecturer Urdu
Government Degree College
Khawaja Bagh
Baramullah-193101 (J & K)
Mob: 7006058095

رفعت اختر

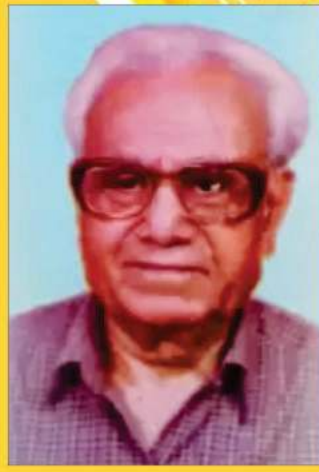

رشید حسن خاں اور ظفر احمد صدیقی کی ادبی خدمات

رشید حسن خاں (1930-2006) اردو ادب کے ایک معتبر نظریہ ساز نقاد اور سلیقہ مند مدون متون ہیں، یہ ان کی وہ صفات ہے جن کو ان کے مخالفین نے بھی تسلیم کیا تھا۔ اردو کے محققین میں ان کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے، انھوں نے نہ صرف کلاسیکی متون کی ترتیب و تحقیق کی بلکہ جدید تحقیق کے اصول و آداب کو بھی عملی سطح پر، متعین کرنے کی کوشش کی۔ خاں صاحب نے املا، لغت، قواعد و زبان، تدوینِ متن، اور ادبی تحقیق کے بارے میں بہت کچھ قلمبند کیا ہے۔ جس میں اصول کی کارفرمائی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ تحقیق کے بارے میں کسی رعایت و مروت کے قائل نہیں تھے، ان کا طریقہ تحقیق اس بات پر مشتمل تھا کہ متعلق موضوع پر شواہدات جمع کرنے کی آخری حد کیا ہو سکتی ہے؟ یعنی کسی معاملے میں جب تک سارے شواہد کو جمع نہیں کر لیتے تب تک قلم نہیں اٹھاتے تھے۔

تحقیق اور متنی تنقید ان کے دو خاص میدان ہیں۔ انھوں نے نہ صرف تحقیق و تدوین کے نادر نمونے پیش کیے بلکہ ان کے اصول وضوابط پر کتابیں بھی تالیف کیں۔ تحقیق کے بارے میں ان کی اہم تصنیف "ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ" ہے۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے تحقیق سے متعلق بڑے کارآمد نکات واضح کیے ہیں۔ تحقیقی روایت میں تعصّبات، تحفظات اور تضادات کی بھی انھوں نے نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں تحقیق سے متعلق چار تبصرے بھی شامل ہیں۔ صحت متن بالخصوص صرفیاتی استعمال کے سلسلے میں ان کی اہم تصنیف "اردو املا" ہے۔ جو ترقی اردو بورڈ ۱۹۷۴ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انھوں نے سائنٹفک انداز میں املے میں مناسب اور موزوں اصطلاحات اور تصحیحات نیز مناسب معنی کے ذریعے اس کو معیاری بنانے کی کوشش کی ہے۔

رشید حسن خاں کے اہم تحقیقی و تدوینی کارناموں میں انتخابِ شبلی، املا نامہ، تلاش و تعبیر، عبارت کیسے لکھیں، تدوین، تحقیق، روایت، فسانہ عجائب، باغ و بہار، گلزار نسیم اور مثنویات شوق کو اہمیت حاصل ہے۔ تدوین کے سلسلے میں ان کے جو ناقابل فراموش کارنامے سامنے آئے ہیں وہ میر امن کی باغ و بہار اور رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب ہے۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں کو مرتب کر کے اپنے بسیط مقدمے میں کلاسیکی متون سے متعلق اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔

ظفر احمد صدیقی (1955-2020) کا شمار عہد حاضر کے مایہ ناز محققین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے تقریباً چالیس برس تک درس و تدریس کی خدمات انجام دیں اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کو قارئین کے لیے

دلچسپ بنادیا۔ظفر احمد صدیقی نہایت ممتاز اہل قلم تھے ان کی علمی وادبی خدمات کے کئی میدان ہیں۔ان میں سب سے پہلے شبلی شناسی ہے۔شبلی کے حوالے سے ان کی پانچ کتابیں (شبلی مونوگراف(1998) (2) مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار(2001)(3)شبلی معاصرین کی نظر میں (2005)(4)شبلی کی علمی وادبی خدمات (2005) (5) شبلی شناسی کے اولین نقوش(2016)منظر عام پر آچکی ہیں۔دوسرا قابل ذکر میدان غالبیات ہے۔انھوں نے نہ صرف غالب کے حوالے سے کئی اہم تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں بلکہ معارف میں 'نسخہ حمیدیہ' کے متعلق ان کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ 'نسخہ حمید' کے متعلق بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔تیسرا اہم کام کلاسیکی شعرا کے کلام کا انتخاب ہے۔کلاسیکی شاعری پر ان کی بہت گہری نگاہ تھی۔انھوں نے مومن اور آبرو کے کلام کا انتخاب کیا اور مقالات نذیر اور نظم طباطبائی کو مرتب کیا ہے۔ادبی حلقے میں نظم طباطبائی کی خوب پزیرائی ہوئی۔اس سے ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔پروفیسر خالد محمود "شرح دیوانِ اردوے غالب" کے پیش لفظ میں ظفر صاحب کے متعلق لکھتے ہیں۔

''پروفیسر ظفر احمد صدیقی ایک دقیقہ سنج محقق،مشفق استاد اور منکسر المزاج انسان ہیں۔ان سے مل کر علمی انکسار کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔تحقیق کے خارزار میں جس ریاضت اور استقامت کی ضرورت ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں اور اس پر عمل پیرا رہتے ہیں۔انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کرنے کی دیانت دارانہ کوشش کی ہے۔ان کا انداز بیاں واضح،مدلل،اور عالمانہ ہے۔نرم روی اور شائستہ بیانی ان کی نثر کے خاص جوہر ہیں۔ادب کے دقیق اور پیچیدہ مسائل بھی ان کی دلیلوں سے پانی ہوجاتے ہیں''۔

(ظفر احمد صدیقی،شرح دیوان اردوے غالب:پیش لفظ از پروفیسر خالد محمود،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی2012ص،4)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی شخصیت ایک طرف اردو ادب میں ممتاز ومنفرد تھی تو دوسری طرف عربی ادبیات میں بھی ان کا رتبہ بلند تھا۔رشید حسن خاں اور شمس الرحمن فاروقی جیسے نابغہ روزگار بھی عربی زبان وادب کے سلسلے میں ان سے رجوع کرتے تھے اور باقاعدہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ان کی علمی وادبی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس الرحمن فاروقی رقمطراز ہیں:

''عربی فارسی پڑھ لینا آسان ہے۔لیکن عربی فارسی تہذیب وتصورات کو ذہن میں جذب کر لینا اور ان کو اردو تنقید میں استعمال کرنا کہ انمل اور بے جوڑ نہ معلوم ہو اور اس عظیم تسلسل کا احساس واضح ہو جو مشرقی ادبیات کا سرمایہ ہے۔یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ظفر احمد صدیقی کی تحریر عربی فارسی تہذیب سے پوری طرح بہرہ ور ہیں۔لیکن انھوں نے ان علوم کو تنگ نظری کی کوٹھری میں نہیں،بلکہ تاریخی تسلسل کی خوشگوار،روشنی میں حاصل کیا ہے۔اسی لیے ان کا طریقہ بھی ادعائی نہیں بلکہ تجزیاتی ہے''

(ظفر احمد صدیقی،تنقیدی معروضات:سرنوشت از شمس الرحمن فاروقی،فلاحی بک ڈپو؛پیلی کوٹھی، وارانسی،ص،ص،4)

رشید حسن خان کے تدوینی کام

رشید حسن خان نے کلاسیکی ادب کے بہت سے متون کو جدید ترین اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔جن میں دو نثری کتابیں 'فسانہ عجائب' (1824)'باغ وبہار'(1802)لغت مصطلحات ٹھگی(،اور چار منظوم متن 'گلزار نسیم'،'سحر البیان'،'مثنویات شوق'اور'کلیات جعفر زٹلی')شامل ہیں۔ان تمام نسخوں کی تدوینی ضخامت اچھی خاصی ہے اور ان کے مقدمات بھی مبسوط طویل اور معلوماتی ہیں۔

خان صاحب نے مقدمات میں تمام تر بنیادی اور معلومات افزا امور پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔تدوین متن کے دوران کتنے خطی اور کتنے مطبوعہ نسخوں سے مدد لی گئی اور کس نسخہ کو بنیاد بنایا گیا،ان کے عکس کن کتب خانوں سے حاصل کیے گئے،اور کس سن اور مطبع سے شائع ہوئے ہیں۔ان نسخوں کو حاصل کرنے میں کتنا عرصہ صرف ہوا۔متن کی تصحیح اور اختلاف تیار کرنے کے لیے مرتب نے کن دیگر کتابوں کی طرف رجوع کیا انھیں بغیر
1.cross verification 2. cross validation 3. cross reference کے تشفی نہیں ہوتی۔خان صاحب نے اپنی زندگی تحقیق و تدوین کی نذر کر دی تھی۔انھوں نے نہ صرف اپنی خواہشات اور آسائشوں کو ترک کر دیا تھا بلکہ خانگی رشتوں کی مسرتوں کو بھی تدوین پر قربان کر دیا تھا۔غالبًا اسی وجہ سے ڈاکٹر گیان چند جین نے ان کو 'خدائے تدوین' کہا۔

(منقول،تدوین متن کی روایت،از ڈاکٹر صابر علی سیوانی 2021،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،ص،21)

فسانہ عجائب کو مرتب کرنے میں ان کو سات آٹھ سال لگے اور اس پر مستزاد ہے۔زیر بحث کتاب میں ایک طویل مقدمہ،سات ضمیمے ،تینوں

ابواب، فرہنگ اور ایک اشاریہ شامل ہے۔فسانہ عجائب کا کام جب مکمل ہو گیا تھا اور یہ کتاب پریس جانے کے لیے تیار تھی، کہ اچانک ان کو خدا بخش لائبریری میں سرور صاحب کے ہاتھ کا آخری نظر ثانی شدہ نسخہ دکھائی دیا۔خاں صاحب نے اس نسخے کا مطالعہ کیا نئے سرے سے ترتیب دیا۔ ان کی طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس نسخے سے قارئین کو بے خبر رکھا جائے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) سے 1990 میں منظر عام پر آئی۔ فسانہ عجائب کے بعد دوسرا اہم کام باغ و بہار کی تدوین ہے جو انھوں نے بیس برس سے زیادہ عرصے میں پائے تکمیل کو پہنچائی۔1963 میں انھوں نے داستان پر کام کرنا شروع کیا اور 1964 میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی کے معیاری ادب سیریز کے تحت یہ اشاعتیں طلبا کے لیے مخصوص تھیں ۔فسانہ عجائب کا تفصیلی اور مبسوط نسخہ 1992 میں انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوا ۔اس میں خلیق انجم صاحب کے حرف آغاز کے علاوہ خاں صاحب کا تیار کردہ تین ضمیمے، فرہنگ اور اشاریہ ہیں۔ باغ و بہار کے متن میں ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے جن کا املا عہد رواں میں بدل گیا ہے یا ان الفاظ کے تلفظ میں تبدیلی آ گئی ہے۔ضمیمے اور حواشی میں ان کے معنیاتی تغیر، املے اور تلفظ کی وضاحت کی گئی ہے۔'گلزار نسیم' کو خان صاحب نے جدید تحقیقی و تدوینی اصول کی پیروی میں مرتب کیا ہے۔کلاسیکی ادب میں یہ ان کا تیسرا شاہکار کارنامہ ہے۔گلزار نسیم کی تدوینی حیثیت اسی لیے زیادہ ہے اس میں انھوں نے اصل متن کے ساتھ ساتھ عزت اللہ بنگالی کے فارسی نثری متن کی بھی تدوین کر کے شامل کیا ہے۔'سحر البیان' کی تدوین خاں صاحب نے جدید اصولوں کے مطابق کی ہے۔اس نسخے کی تدوین کے لیے انھوں نے بارہ خطی نسخے ہندوستان، پاکستان اور لندن سے جمع کیے تھے۔خان صاحب نے ان تمام نسخوں کا سالِ تکمیل، یہ کس کس کتب خانے میں دستیاب ہیں، کس کے ذریعے ان کے عکس حاصل کیے گئے ہیں، ان تمام باتوں کی وضاحت انھوں نے زیر نظر کتاب میں کی ہے۔علاوہ ازیں رشید حسن خاں نے مرزا شوق لکھنوی کی تینوں مثنویوں کو ایک ساتھ جدید ترین اصولوں پر مرتب کر کے شائع کیا، جو آنے والی نسلوں کی علمی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔اس مثنوی کو تدوین کاری کرنے کے لیے جس چیز نے ان کو راغب کیا وہ لکھنؤ کی زبان ہے۔لکھنوی زبان کی نرمی ان مثنویوں میں نمایاں طور پر استعمال کی گئی ہے۔ زیر نظر کتاب کی تدوین کا کام یکم جنوری 1995 کو شروع ہوا جنوری 1996 کے آخر میں آپ شاہ جہاں پور منتقل ہو گئے۔1997 کو ان تینوں مثنویوں کی کتابت مکمل ہوئی۔ مثنویات شوق انجمن ترقی اردو (ہند) سے ماہ اپریل یا مئی (1998) کو چھپ کر منظر عام پر آئی۔ اگلے سال یعنی 1999 کو اس کا ایک ایڈیشن پاکستان سے بھی شائع ہوا۔خان صاحب کی ایک خوبی یہ تھی جب وہ کلاسیکی متن کو مرتب کرنے کا ارادہ کرتے تھے، اس سے پہلے اس کے مواد کو جمع کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ایک کام کے ختم ہوتے ہی بغیر وقت کو ضائع کیے ہوئے، دوسرا کام شروع کر دیتے تھے۔مثنویات شوق کو مرتب کرنے کے بعد ظفر احمد صدیقی کو ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

''اب میری سنیے: مجھے نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی بہارِ عشق کی اشاعتِ قدیم درکار ہے 1264ھ کا یا 1267ھ کا نسخہ۔ نقوی صاحب سے بھی پوچھیے۔آپ کی لائبریری میں اسے ہونا چاہیے۔آپ نے اپنی خاطر بہت زحمتیں اٹھائی ہیں اب اِسے بھی گوارہ کر لیجئے۔شوق کی مثنویوں کا متن مرتب کرنا شروع کیا ہے۔اس سلسلے میں آپ حضرات کی امداد از بس ضروری ہے۔' زہر عشق' کا پہلا ایڈیشن 1862 میرے پاس ہے۔' بہارِ عشق'، 'فریب عشق' کے پھیر میں آ گیا ہوں کچھ کیجئے میرے بھائی!''

(رشید حسن خاں بنام ظفر احمد صدیقی، مرتب ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا، ص،4)

رشید حسن خاں کے مدون کتب پر ظفر احمد صدیقی کے تبصرے:

رشید حسن خاں کا شمار اردو ادب کے معتبر مدونوں کی صف میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے تحقیق و تدوین کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی، قاضی عبدالودود ان تمام حضرات نے جو روایت قائم کی تھی، خان صاحب نے اس کی توسیع کی اور انھوں نے یہ ثابت کیا کہ تحقیقی و تدوین کا کام کرنے کے لیے صرف علم کافی نہیں بلکہ اس فعل سے ذہنی مناسبت بھی درکار ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب 'تحقیق کا فن' میں محقق اور مدون کے اوصاف سے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

''تحقیق محض ایک ادبی مشغلہ نہیں، یہ ایک مسلک، ایک ذہنی رویہ، ایک طرز زندگی ہے۔ یہ سچ کا کاروبار ہے محقق کو تحریر میں، نیز روزانہ زندگی میں سچ کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔''

(تحقیق کا فن، گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ،2007،ص،52)

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ خاں صاحب نے بہت سی کتابوں کی ترتیب و تالیف کی ہے اور ان پر گراں قدر مقدمے بھی لکھے ہیں۔کلاسیکی ادب کی تدوین نگاری نے ہی ان کو اردو ادب میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ان میں سب سے پہلے انھوں نے 'فسانہ عجائب' کی تدوین کی۔ 'فسانہ عجائب' مرتب رشید حسن خاں کی اشاعت انجمن ترقی اردو (ہند) نئی

دہلی کی جانب سے عمل میں آئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب 719 صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کا پیش لفظ اور خلیق انجم صاحب نے حرف آغاز لکھا ہے۔ اس کے بعد صفحہ 15 سے 16 تک مرتب کا طویل مقدمہ ہے جس کو ایک مستقل تصنیف کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مقدمے کی ابتدائی حصے میں انھوں نے ترتیب و تدوین کے اصول و آداب بیان کیے ہیں اور وہ لکھتے ہیں:

''تدوین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی متن کو ممکن حد تک منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں بنیادی حیثیت صحتِ متن کی ہوتی ہے''

(مقدمہ فسانہ عجائب، مرتب رشید حسن خان،1996، ص،22)

اس کے علاوہ انھوں نے رجب علی بیگ سرور کی ولادت، تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت، کتاب کا نام وجہ تصنیف زمانہ تصنیف، نوازش اور اصلاح، بیان لکھنؤ کا اختلاف، میر امن اور باغ و بہار کا قصہ، ضمنی داستانیں اور اردو زبان جیسے عنوانات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ کتاب کے مقدمے کے بعد 'فسانہ عجائب' کا متن سامنے آتا ہے۔ اساتذہ اور طلباء دونوں کے لیے کلاسیکی متن پڑھنا بہت مشکل ہو گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی تعلیم گویا ختم ہو گئی ہے اور اردو کو اب کم سراہا جاتا ہے۔ ان حالات میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شامل نصاب متن کو مرتب کر دیا جائے تا کہ طالب علم اس کو آسانی کے ساتھ پڑھ سکے۔ تصحیح متن کے علاوہ متن کی ترتیب میں اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ یائے معروف یا مجہول کی کتابت میں تفریق برتی جائے، اس طرح مشکل لفظوں پر حرکات لگائے جائے، پیراگراف قائم کیے جائیں، علامت اور رموز واوقاف کی بھی پابندی کی جائے۔ کتاب کے متن کے بعد ضمیموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تعداد میں سات ہیں۔ پہلے ضمیمے کا عنوان ''نثر ہائے خاتمہ کتاب'' ہے۔ دوسرے ضمیمے کا عنوان ''تشریحات'' ہے۔ اس میں متن کے بہت سے حصوں کی تشریح کی گئی ہے۔ تیسرے ضمیمے کا انتساب ''اشعار'' سے متعلق ہے۔ چوتھے ضمیمے کا عنوان "اشخاص، مقامات اور عمارات" سے متعلق ہے۔ پانچویں ضمیمے کا عنوان ''تلفظ اور املا'' ہے۔ چھٹے ضمیمے کا عنوان ''الفاظ اور طریقہ استعمال'' ہے۔ ساتویں ضمیمے کا عنوان "اختلاف نسخ" ہے۔ ضمیموں کے علاوہ فرہنگ بھی شامل کتاب ہے۔ زیرِ نظر کتاب تین حصوں میں تقسیم ہیں۔ (الف) میں متن کے قابل تشریح مفردات و مرکبات کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔ (ب) میں عربی فقروں اور عبارتوں کے ترجمے تحریر کیے گئے ہیں۔ (ج) میں فارسی اشعار اور فقروں اور عبارتوں کے ترجمے کیے گئے ہیں اور آخر میں متن کتاب کے اشخاص واماکن اشاریہ تیار کیا گیا ہے۔

رشید حسن خان تحقیقی و تدوینی دنیا کی وہ عظیم شخصیت تھے جنھوں نے کلاسیکی متون کی تدوین ایسی کتابوں کے حوالوں سے کی جن تک عام محقق کی رسائی ممکن نہیں۔ کلاسیکی متون کی ترتیب و تدوین میں ان کا پہلا عہد آفریں کارنامہ 'فسانہ عجائب' منظر عام پر آ چکا تھا جس کی علمی و ادبی حلقوں میں پزیرائی اور ادادو تحسین کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ دوسری اہم کتاب 'باغ و بہار' منظر عام پر آئی۔ فسانہ عجائب کی طرح باغ و بہار کی تدوین بھی اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس کی ترتیب و تدوین بھی رشید حسن خاں نے منشائے مصنف کے مطابق کی ہے۔ یہ 848 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں 124 صفحات کا بسیط و جامع مقدمہ شامل ہے، مرتب نے مقدمے میں تمام اہم نکات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد اہم ذیلی عنوانات اس طرح ہیں حالات زندگی، باغ و بہار، آغاز و اختتام، باغ و بہار، ترجمہ تالیف و تصنیف/ خطی نسخے، باغ و بہار کی نثر وغیرہ۔ باغ و بہار کی ترتیب و تدوین بھی 'فسانہ عجائب' کی طرح انتہائی سائنٹفک انداز میں کی گئی ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ متنی تنقید کے تمام اصولوں کی کارفرمائی ہے بلکہ مرتب نے مقدمے میں جن نکات پر گفتگو کی ہے وہ ان سے پوری طرح واقف ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار کے تعلق سے کہاں کہاں اور کیا کیا لکھا ہے مرتب ان تمام باتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ خاں صاحب نے یہ مقدمہ اس طرح لکھا ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ جامعیت کا معاون بن گیا ہے۔ مقدمے کے بعد باغ و بہار کا متن شامل کیا گیا ہے جو 250 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نسخے کی بنیاد باغ و بہار کے پہلے مطبوعہ نسخہ پر رکھی گئی ہے، کیونکہ یہ میر امن کا نظر ثانی کیا ہوا مکمل متن ہے۔ اس کے علاوہ مرتب نے بعض دیگر نسخوں سے بھی مدد لی ہے جن میں سب سے اہم ہندی مینول ہے جو 102 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈنکن فاربس کی مرتبہ باغ و بہار کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ڈنکن فاربس کا تیار کردہ نسخہ دو اہم قلمی نسخوں کی بنیاد پر مشتمل ہے۔ تدوین متن کے دوران انھوں نے ایک ایک لفظ کو کئی کئی نسخوں سے ملایا ہے۔ لفظ کو مروجہ صورت میں استعمال کرنے کے باوجود ان کے دماغ میں کوئی شک پیدا ہوتا تو اس کو دور کرنے کے لیے وہ دوسروں سے پوچھنے میں تکلف نہیں کرتے تھے۔ مثلاً؛ باغ و بہار کے متن کے صفحہ 119 اور 120 پر لفظ 'پنڈت خانے' آیا ہے تدوین کے دوران خان صاحب کو الجھن محسوس ہوئی تو اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ڈاکٹر گیان چند جین کو 4

نومبر 1988 کو لکھا اور معلوم کیا کہ:

"میر امن نے قید خانے کے لیے 'پنڈت خانے' لکھا ہے متعدد مقامات پر مجھے اس کی اصل نہیں ملتی۔ آخر 'پنڈت خانے' اور جیل خانہ کا تعلق کیا ہے؟ کیا آپ نے کہیں یہ لفظ (پنڈت خانے) ان معنوں میں پڑھا ہے"۔

(رشید حسن خاں کے خطوط، اشاعت، فروری، 2011، اردو بک ریویو، ص، 784)

اس خط سے رشید حسن خاں کی دقت نظر اور صحیح ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کے اضطراب و جستجو کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کے متن کے بعد ضمیموں کا سلسلہ آتا ہے جس کے تحت تین ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔ پہلے ضمیمے کا عنوان "تشریحات، اختلاف نسخ، انتساب اشعار، افراد، مقامات، عمارتیں" ہیں۔ دوسرے ضمیمے کا عنوان "تلفظ اور املا" ہے۔ تیسرے ضمیمے کا عنوان "الفاظ اور طریقہ استعمال" ہے۔ یہ ضمیمے زبان دانی اور اس کے صرفیاتی و معانیاتی استعمال سے واقفیت کے لیے خاص طور پر مفید ہیں۔ اس کے آخر میں ایک فرہنگ بھی شامل ہے جو ظاہر ہے کہ خاص تناظر اور برمحل تصورِ معنی کی گرہ کشائی کرتی ہے۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ انھوں نے 'فسانہ عجائب' اور 'باغ و بہار' جیسے عالمانہ ترتیب و تدوین کے ذریعے ایک طرف تو ان کتابوں کی مستند تدوین کا فریضہ انجام دیا دوسری طرف کلاسیکی متون کی تدوین کا معیار بھی بلند کیا جہاں تک ایک عام محقق کی نظر کو پہنچنا ناممکن سی بات ہے۔

ادبی اور تحقیقی معلومات سے متعلق خطوط

خطوط کسی بھی ادبی شخصیت کا ایسا آئینہ ہوتے ہیں، جو اس کی ذہنی تصویر قارئین کے سامنے پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ کیونکہ خطوط میں وہ اپنے جذبات کو بلا جھجک صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ رشید حسن خاں اور ظفر احمد صدیقی دونوں کی شخصیت کثیر الجہات تھی۔ لیکن ان کی اصل شہرت بے باک نقاد اور مدون کی حیثیت سے سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ ان دونوں میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی تھیں۔ دونوں نے مشرقی اصول نقد کی پیروی کی، مغربی اصول سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ رشید حسن خاں کے زیادہ تر خطوط متنی تنقید کے تعلق سے ہوتے تھے انھوں نے اپنی پوری زندگی کلاسیکی متون کو مرتب کرنے میں صرف کر دی ہے۔ ان کے پاس کثیر تعداد میں قدیم و جدید لغت موجود تھی۔ پھر بھی اگر ان کو کسی لفظ کے بارے میں شک ہو جاتا تو وہ کسی معتبر شخصیت کو لکھ کر معلوم کرتے کہ کیا آپ نے اس لفظ کو اس صورت میں استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے نام ایسے درجنوں خطوط موجود ہیں۔ ظفر احمد صدیقی جب بنارس کو خیرآباد کہہ کر علی گڑھ منتقل ہوئے تھے تب خان صاحب نے اس دکھ کا اظہار حنیف نقوی صاحب سے ایک خط میں کچھ اس طرح کیا تھا:

"صدیقی صاحب جیسا لائق پڑھا لکھا اور کلاسکی ادب سے واقف شخص اب آپ کو کہاں ملے گا۔ پورے ہندوستان میں ایسے شاید ایک دو شخص ہوں گئے"

خاں صاحب، ظفر احمد صدیقی صاحب کی خوش ذوقی اور صاحب نظری کے اس درجہ معترف تھے کہ اپنی کسی کتاب کا ان کے پاس موجود نہ ہونا اپنے لیے باعث شرم سمجھتے تھے۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب کے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں کہ رشید حسن خاں جیسے قلندر مزاج، بے نیاز و بے باک نقاد ان سے حسن نظر کا طالب رہا ہے۔ ویسے رشید حسن خاں کے نام سینکڑوں خطوط لکھے گئے ہیں جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں جلدیں اس بات کی گواہ ہیں کہ اتنا اعزاز خاں صاحب نے کسی اور کو نہیں دیا۔ خاں صاحب کی خوبی یہ تھی کہ جب کسی سے تعلق جوڑ لیتے تھے اس کو ایمانداری سے نبھاتے تھے۔ انھیں ظفر صاحب میں مستقبل کا ایک محقق نظر آتا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کی کسی تحریر میں کوئی جھول نہ ہو۔ وہ ان کی بہت زیادہ قدر کرتے تھے اور انھیں اپنوں کی طرح مشورہ بھی دیتے تھے، کیونکہ ان کو اس بات کا علم تھا کہ وہ میری کسی بات کا برا نہیں مانیں گے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خط ملا۔ وہم دور ہوا اور دل مسرور ہوا۔ جیتے رہیے اور خوش رہیے میرے حلقے احباب اور زمرہ متعلقین میں ایسے لوگ اب کم اور بہت کم رہ گئے ہیں جن کو خط لکھنے کو جی چاہیے؛ یہ وجہ ہے کہ آپ سے شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے اور خط کا بھی انتظار رہتا ہے۔ بیماریوں نے اب میرا احوال ذہنی طور پر مرزا غالب کے اشعار کا مصداق بنا دیا ہے:

نے زدانش کامیاب و نے زبختی تنگدل
شرمسار کوشش برجبیں و کیوانش منم
ماندہ ام تنہا ازدور باش یاس وضع
خانہ دارم کہ پندا ند دربانش منم"

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتبہ ٹی، آر، رینا، جلد اول، ص 700، 701)

خاں صاحب نے کل 48 خطوط ظفر احمد صدیقی کے نام لکھے ہیں۔ 16 اکتوبر 1884 سے ان کا ادبی رشتہ ظفر صاحب سے قائم ہوا اور تقریباً 20 سال تک جاری و ساری رہا۔ ادبی رشتے اس وجہ سے قائم رہتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے قدردان ہوں ان دونوں میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ خاں صاحب کسی پروگرام میں علی گڑھ آئے

تھے یہاں ظفر صاحب سے ان کی ملاقاتیں اور ادبی گفتگو ہوئی۔ اپنے وطن واپس لوٹنے کے بعد انھوں نے خط لکھا:

''بہ عافیت پہنچ گیا۔ آپ نے جس محبت اور تعلق خاطر کے ساتھ میرے ساتھ وقت گزارا اور اسٹیشن تک جانے کی زحمت گوارا کی، اس کے لیے منت پذیر ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میری توقع کے عین مطابق ہوا۔ آپ سے ایسی توقعات وابستہ نہ کروں گا تو اور کہاں جاؤں گا اور کدھر جاؤں گا اور کدھر دیکھوں گا۔ علی گڑھ میں ایک آپ ہیں اور میرے پرانے رفیق مسعود عالم صاحب؛ آگے آیت۔۔۔۔ باقی سب سے سلام دعا ہے''۔

(رشید حسن خاں کے خطوط، مرتبہ ٹی، آر، رینا، جلد اول، ص715، 716)

رشید حسن خاں بنام ظفر احمد صدیقی

و

ظفر احمد صدیقی بنام رشید حسن خاں

ادبی تحقیق اور کلاسیکی تدوین نیز علمی معلامات کے نقط نظر سے رشید حسن خاں اور ظفر احمد صدیقی کے خطوط معلومات کا خزانہ ہیں۔ دونوں نے کلاسیکی متون کو جگرکاوی کے ساتھ مرتب کیا۔ اپنے ان ہی ادبی کارناموں کی وجہ سے اردو دنیا میں ان کا مرتبہ بلند و بالا ہے۔ تحقیق و تدوین کے دوران اگر خاں صاحب کو کسی لفظ، شعر، حدیث یا کسی مسئلہ کو سمجھنے میں الجھن محسوس ہوتی تو وہ اپنے بڑوں سے یا اپنے ہم عصروں سے رابط قائم کرتے تھے، اور جس سے بھی ان کو تسلی بخش جواب ملتا اس کا نام حواشی میں درج کر دیتے تھے۔ ظفر احمد صدیقی عربی زبان کے عالم تھے۔ اس لیے خاں صاحب ان کو مولانا کہہ کر مخاطب کرتے دوسری بات اگر کہیں کوئی حدیث یا قرآنی آیات کے بارے میں ان کو شک ہوتا تو وہ ظفر احمد صدیقی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ انہی باتوں کی روشنی میں خاں صاحب ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اب ایک زحمت۔ یہ مشہور قول: ماعرفناک حق معرفتک، کچھ معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ کس کا قول ہے؟ میرامن نے گلستان کے دیباچے میں اس کو درج کیا ہے مگر اس طرح کے اس مقولہ کا ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ چوں کہ مجھے باغ و بہار میں اس مقام پر یہ صراحت ضرور کرنا ہے کہ یہ ہے کیا؟ حدیث یا قول، یوں آپ کو زحمت دے رہا ہوں اور آپ ہی کے حوالے سے آپ کی تحریر درج کی جائے گی۔ اس طرح توجہ فرمائیے، مگر یہ درخواست ہے کہ التفاتِ توجہ جلد تر ہو، اس لیے کہ حواشی کی کتابت شروع ہوگئی ہے، آپ کے خط کا مجھے ابھی سے انتظار ہے۔ نقوی صاحب کو بھی آج ہی خط لکھا ہے۔''

(رشید حسن خاں وظفر احمد صدیقی، مرتب، ٹی۔ آر۔ رینا اشاعت؛ جون، 2021، ص، 21)

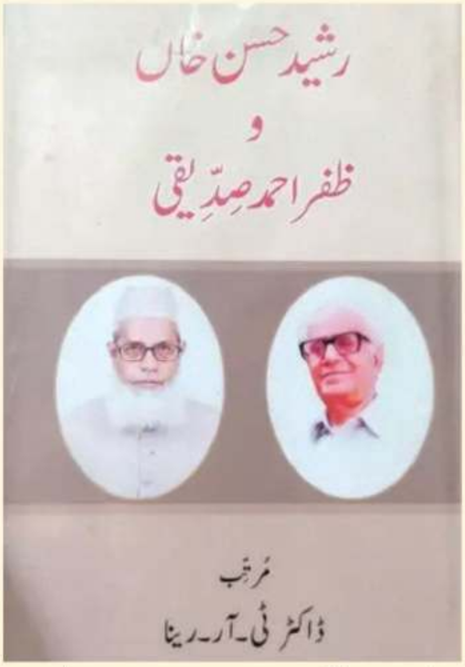

ظفر احمد صدیقی نے جو خط کا جواب دیا تھا وہ اس طرح ہیں۔

''خط مل گیا، شکریہ۔ ایک پہلو یہ ہے کہ زیر بحث ٹکڑا ممکن ہے کہ کسی حدیث کا درمیانی جز ہو۔ یہ محض احتمال ہے، مگر ہوسکتا ہے۔ ہزاروں جعلی حدیثوں میں سے ایک یہ بھی ہوسکتی ہے۔ اشاریہ احادیث میں ظاہر ہے کہ درمیان اجزا کا حساب نہیں رکھا جاسکتا۔ بہ ہر حال، فی الوقت تو یہی صورت ہے کہ میں اسی صورت حال کو بدل تشریح درج کروں گا۔ آئندہ کبھی اگر کچھ معلوم ہوا تو دیکھا جائے گا۔''

(رشید حسن خاں وظفر احمد صدیقی، مرتب، ٹی۔ آر۔ رینا، اشاعت؛ جون 2022، ص 22)

□□□

Rifat Akhtar

R-161, 4th Floor

Gali No 6 Joga Bai Extension

Jamia Naga

New Delhi-110025

ساجدہ خاتون

ناول فردوسِ بریں اور شیخ وجودی

بیسویں صدی کے ربع اول میں ناول اور افسانہ کے لیے غیر معمولی طور پر فضا سازگار ہوئی اور یہ دونوں اصناف حقیقت نگاری سے متعارف ہوئیں۔ نتیجتاً کہانیوں کے ذریعے کرداروں کی تخلیق میں بھی فکشن نگاروں نے غیر معمولی طور پر ہنرمندی کا ثبوت دیا۔ کارل مارکس اور فرائڈ کے نظریات جب فکشن کا حصّہ بنے تو راونڈ کیریکٹر منظر عام پر آنے لگے جو ظاہری اور داخلی ساخت کے اعتبار سے لحہ بہ لحہ خود کو تبدیل کرنے پر قادر تھے۔ جن کے باطن میں وقوع پذیر تبدیلیاں سماج اور ماحول کی صورتحال کے اعتبار سے خود کو بدلنے میں مصروف تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ناول جن مرکزی کرداروں پر منحصر ہوتا تھا ان کرداروں کے بعض ایسے امتیازات ضرور ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ان کی مثبت یا منفی شناخت کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ ایسے مثبت اور منفی کردار کہانی میں ایک دوسرے کے بالمقابل برسر پیکار ہوتے ہیں جن سے واقعات میں ارتقا ہوتا ہے اور کشمکش پیدا ہوتی ہے اور آخر کار کہانی ایک نتیجہ خیز سوالیہ نشان پر ختم ہوجاتی ہے۔ کہیں قدروں

کا، کہیں تہذیب وثقافت کا، کہیں قومی ناموس کا تو کہیں جذبات واحساسات کا مسئلہ شکست وریخت یا فتح وکامرانی سے دوچار ہوجاتا ہے۔ جب کبھی جبر واستحکام، خودغرضی اور سفا کی حاوی نظر آتی ہے تو اس کے نمائندہ کردار حاوی ہوجاتے ہیں جنھیں ہم منفی کرداروں کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی مثبت قدریں معصومیت اور خلوص و وفا، عدل وانصاف قائم ہو جاتا ہے تو مثبت کردار ایک نئی روشنی کی صورت میں بیدار ہوجاتے ہیں۔

اردو ناول کا عہد بہ عہد جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے کئی کردار منفی انداز میں منظر عام پر آتے ہیں اور ہماری کردار نگاری کے باب میں یادگار بن جاتے ہیں۔ ان کی اپنی الگ اور ممتاز حیثیت ہے خصوصی طور پر تاریخی ناولوں میں ایسے کئی کردار ہیں جنھوں نے اپنی طاقت، حکومت، دولت وثروت کی بنیاد پر اپنی انفرادی صلاحیتوں اور جبر واستحکام کے ذریعے خطۂ ارض کے بڑے علاقوں اور وقت کے کئی زمانوں پر اپنے گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ اردو ناول نگاروں نے ایسے کرداروں کی تعمیر وتشکیل میں بڑی ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے جیسے شیخ وجودی (فردوس بریں)۔ عبدالحلیم شرر نے شیخ وجودی جیسا مضبوط منفی کردار اردو ادب کو دیا اور عزیز احمد نے تیمور اور سلطان حسین جیسے منفی کردار اردو ناول میں تخلیق کیے۔

شرر کے عہد میں لکھے گئے دیگر ناولوں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ شیخ وجودی سے قبل اردو ناول میں عموماً سپاٹ اور سیدھے کرداروں کی موجودگی رہی ہے۔ خود شرر کے دوسرے ناولوں کے کردار بھی عموماً یکسانیت کا شکار اور مماثل صفات کے حامل نظر آتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر کے ناول فردوس بریں میں شیخ علی وجودی ایسا کردار ہے جو پہلی بار مبہم خاکے کے بغیر منفرد، پیچیدہ اور منفی خصوصیات کے ساتھ سامنے آیا۔ شرر کے زیادہ تر ناولوں کی طرح یہ ناول بھی تاریخی ہے۔ اس کی کہانی فرقہ باطنیہ کے سرغنہ شیخ علی وجودی کے اردگرد گھومتی ہے۔ انسانی سیرت کے مختلف رجحان کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے یہ کردار اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اردو ادب میں حیات ابدی حاصل کر چکا ہے۔

اس ناول کے حوالے سے سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''شیخ علی وجودی پر داستان نہیں بلکہ اپنے سارے زہد، اتقاء، علم ودانش اور روحانی کمال کے ادعا کے باوجود اس کی جگہ قصہ میں ولن کی ہے۔ شیخ علی وجودی ایسا ولن ہے جو قصے میں منظر عام قاری پر تھوڑی ہی دیر بعد اپنی حیثیت واضح کر دیتا ہے لیکن جس کی یہ حیثیت ہیرو پر قصہ ختم ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کھلتی ہے۔''

شیخ علی وجودی اردو ناول میں ایسا پرکشش منفی کردار ہے۔ جس کے اندر بے شمار منفی خصوصیات موجود ہیں اس کے ذریعہ اردو ناول کو پہلی بار ایسا ولن ملا، جو جاندار اور پراسرار شخصیت کا حامل ہے۔ اس میں وہ تمام مجرمانہ خصوصیات ہیں جو کسی مہم کو سرانجام دینے والے ولن کے لیے ضروری ہیں۔ اس کی مصنوعی پاکی علمیت، جاہ وجلال سب فنکارانہ ہیں۔ اس کی عیاری میں بھی ایک حسن ہے فرقہ باطنیہ کے دوسرے عیار اور چالباز اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس کردار میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو فرقہ باطنیہ کے سرغنہ کے لیے لازم ہیں۔ اس کے ظاہر وباطن میں تضاد ہے لیکن قول وفعل میں تضاد نہیں، اسے اپنے منصب کا پورا احساس ہے۔ شیخ کو اس بات کا پورا علم ہے۔ اسے پوری طرح یہ قدرت حاصل ہے کہ کس طرح اپنے ہزاروں معتقدین کو نہ صرف یہ کہ اپنے قابو میں رکھنا ہے بلکہ انھیں اپنے انقلاباتی خیالات سے آگاہ کرکے ان پر اثر ڈالتے ہوئے اپنے کام میں لانا ہے۔ اس کے جال میں گرفتار ہوکر نکلنا قریب ناممکن ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حسب ضرورت اپنے کردار وگفتار میں بدلاؤ لاتا ہے اور اپنے مریدوں کو اندرونِ خانہ کی خبر نہیں لگنے دیتا۔ ایک ہی وقت میں وہ غیظ وغضب اور شفقت ومحبت کا ایسا برتاؤ کرتا ہے کہ اس کے مریدین اپنی عقلی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ شیخ علی وجودی اپنے مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے اپنے عقائد کی تبلیغ اور عزائم کی تکمیل میں تمام قسم کے حربے آزمانے پر قادر ہے اس کے اندر صحیح اور غلط میں ابہام پیدا کر کے کسی کو اپنے قابو میں کرنے اور اپنا آلہ کار بنانے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے خواہ جھوٹ کا سہارا لینا پڑے یا قتل کی حد تک جانا پڑے وہ کسی بھی قسم کے منفی اقدام سے گریز نہیں کرے گا۔

وقت اور مواقع کے حساب سے تمام قسم کے اخلاقی قوانین بالائے طاق رکھ کر اپنے منفی عمل کا جواز پیش کرنے میں اسے مہارت ہے۔ شیخ علی وجودی کو حسین کی کمزوریوں کا پورا علم ہے۔ اس لیے بڑی لیاقت سے اسے استعمال کرتا ہے۔ وہ حسین کو قائل کرنے کے لیے پہلے شک اور مغالطے میں مبتلا کرتا ہے اور دنیاوی عیش کے خواب دکھا کر یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ارتکاب گناہ کے بعد مختلف دلائل دے کر ضمیر کی آواز دبا دیتا ہے۔ حسین جب آٹھ دن سفر کر کے شام کے وقت مسجد الشماتین میں پہنچا اور شیخ کا انتظار کرنے لگا وہ خود سے کہتا ہے۔ اقتباس:

> ''مجھے یقین نہیں کہ شیخ سے مل سکوں۔ ابھی یہ جملہ اس کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ ایک شخص آیا اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اور مسکرا کے نہایت ہی تسلی وتشفی کے لہجے

میں بولا۔حسین میں جانتا ہوں تو میری تلاش میں آیا ہے۔''

یہاں شیخ علی وجودی کا ذہن، شاطر اور عیار نظر آتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار حسین اس کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ شیخ علی وجودی انسانی فطرت کا نکتہ شناس ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس طرح اس کو قابو میں کریں، اقتباس:

''اے بحر وجود اور دریائے وحدت کے ذلیل و ناپاک قطرے تیرا کیا حوصلہ ہے کہ اس غیر وجود اور اس لاہوت غیر متنوع کے رموز سمجھ سکے''

اس کے ذریعہ وہ اپنے عقیدہ باطنیہ کے نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس کے جذبات کو قابو میں کرنے کے لیے ضروری تھا۔

حسین جب شیخ وجودی سے سوال کرتا ہے اس وقت غصہ سے جواب دیتا ہے ''ولا تجسسو۔ان رموز معنی کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے''۔

وہ حسین کو اس طرح قابو میں کرتا ہے کہ اپنے مقصد کے خلاف کوئی سوال کرنے کی اجازت نہیں دیتا مرکزی کردار یعنی حسین کے دل و دماغ کو تسخیر کر لیتا ہے۔ حسین کے کانوں میں ہر وقت شیخ کی آواز گونجتی، اس کے دل میں ہر لحظہ شیخ کے احکام کا انتظار رہتا۔

وہ زہد و تقویٰ کا لبادہ اوڑھ کر عوام کو دھوکہ دیتا ہے۔ اپنی راہ میں جو شخص بھی مزاحم محسوس ہوتا بلا تامل قتل کے ذریعہ راستہ صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ حسین کو اس کے چچا کے خلاف بھڑکا کر اس کے قتل کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ اس قتل کا فرمان جاری کرنے میں کسی قسم کی جھجک کے بجائے اس کی سفاک ذہنیت سامنے آتی ہے۔ حسین کو اس مہم پر بھیجنے سے پہلے اس کا مکالمہ ملاحظہ ہو:

"شیخ: تو جاؤ امام نجم الدین نیشاپوری کو قتل کر دو

حسین: بہتر، لیکن اگر میں مارڈالا گیا

شیخ: کوئی مضائقہ نہیں

حسین: تو میں رخصت ہوتا ہوں

شیخ: ٹھہرو، اس خنجر کو اپنے پاس رکھو جس وقت موقع ملے اس سے کام لینا''

شیخ وجودی اس قتل کے بدلے حسین کو زمرد تک پہنچنے کا یقین دلاتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ حسین زمرد کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اقتباس دیکھیے:

"شیخ: بہتر تو زمرد سے ملے گا؟ اس کے وصل سے کامیاب ہوگا مگر اس کے لیے اچھی طرح تیار ہے؟

حسین: دل و جان سے تیار۔

شیخ: دیکھ تجھے تامل نہ ہو۔

حسین: ذرا نہیں۔

شیخ: تیرے دل میں شک اور بدعقیدگی نہ پیدا ہو۔

حسین: میں ہرگز نہیں۔

شیخ: وہ جرأت کا کام ہے۔

حیسن: میں جان لڑا دوں گا۔''

جب حسین قتل کر کے واپس آتا ہے تو شیخ وجودی نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ اس کے قلب کو مطمئن کرتا ہے اس کے آگے مرکزی کردار معدوم ہو کر رہ گیا۔ وہ دوسروں کی کمزوری سے پورا فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔ جب وہ امام نجم الدین نیشاپوری کا قتل کرتا ہے تو گناہ گار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے فعل پہ نادم ہے۔ لیکن شیخ کی تقریر نے اس کے دل سے سب داغ محو کر دیے۔ لہٰذا وجودی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور قتل کے صلہ میں زمرد سے ملاقات اور لاہوت اکبر کی سیر کراتا ہے۔ پھر جنت سے نکال دیتا ہے کیونکہ اس سے پھر کام کرانا ہے۔

خلاصہ یہ کہ شیخ وجودی نہایت چالاک اور ذہین ویلن ہے عموماً منفی رخ میں جانے اور صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بنا کر پیش کرنے میں جس قسم کے پر اعتماد، متکبر فعال اور متحرک ذہن کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام خصوصیات شیخ وجودی میں پائی جاتی ہیں جو اپنی نرالی منطق سے لوگوں کے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک ختم کرتا ہے اور جہاں منطق بے کار ثابت ہو تو اداکاری کا سہارا لیتا ہے۔ اس کی اداکاری اتنی کامیاب ہے کہ برسوں ساتھ رہنے کے باوجود اس کے راز پوشیدہ ہیں۔ کبھی وہ براہ راست سامنے آتا ہے کہیں خود منظر سے غائب ہو کر ایسی طاقتوں کو ابھار دیتا ہے جو ہیرو کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں۔ حالات اور ضروریات کے حساب سے جا بجا اس کی نخوت و غرور، سفاکیت اور بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ، اخلاقی، مذہبی، تہذیبی ہر اعتبار سے منفی ہے۔ وہ آخر دم تک منفی اثرات کا حامل رہتا ہے۔

❑❑❑

Sajida Khatoon

Dept. of Urdu

Jamia Millia Islamia

New Delhi-110025

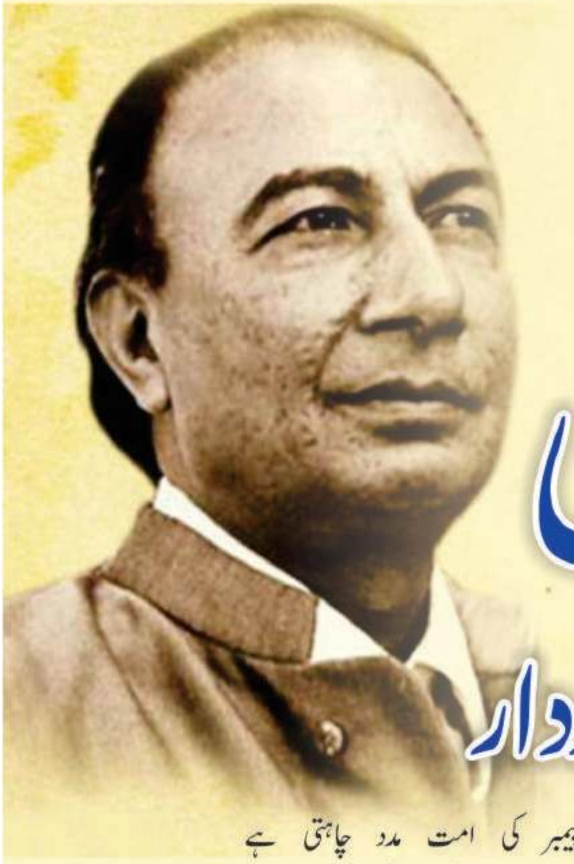

ثنا اسد

ساحر لدھیانوی
کی نظموں میں عورت کا کردار

اگرچہ رشید جہاں تا واجدہ تبسم متعدد ادیباؤں نے معاشرہ میں لڑکیوں اور خواتین پر ظلم وجبر اور ان کے معاشی، سماجی، روحانی وجسمانی استحصال کے خلاف قلمی جہاد کیا اور انھیں اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دی تاہم بہت سے روشن خیال اور ترقی پسند مردوں نے بھی خواتین کے حق میں آواز بلند کی اور اُن پر ہونے والے مظالم کی عکاسی کرتے ہوئے انھیں اپنے حق کے لیے آگے بڑھنے کی تلقین کی۔ایسے ادیبوں اور شعراء میں منشی مریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اسرار الحق مجاز، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری اور ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔اگرچہ بیشتر شعراء نے صرف مشاعروں، شعری نشستوں اور جرائد تک ہی اپنی نظموں کو محدود رکھا لیکن ساحر لدھیانوی نے مذکورہ بالا تمام ذرائع کے ساتھ ساتھ ہی اپنے فلمی نغموں میں بھی کھل کر عورتوں پر ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کی۔ان کی نظم 'چکلے'' دل ودماغ کو جھنجھوڑنے اور دعوت فکر دینے والی ہے۔اس نظم کا یہ بند ملاحظہ کریں:

یہ پر پیچ گلیاں یہ بدنام بازار
یہ گمنام راہی یہ سکوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے ، یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیس مشرق کہاں ہیں

اور پھر ساحر کہتے ہیں:

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس ، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت مدد چاہتی ہے
ثنا خواں تقدیس مشرق کہاں ہیں

ساحر کی یہ نظم فلم 'پیاسا' میں محمد رفیع کی آواز میں فلمائی گئی تھی اور مقبول ہوئی تھی۔

اپنی ایک اور نظم میں جسے لتا منگیشکر نے فلم 'سادھنا' کے لیے گایا تھا، ساحر فرماتے ہیں:

مردوں نے بنائیں جو رسمیں اُن کو حق کا فرمان کہا
عورت کو زندہ جلنے کو قربانی اور بلیدان کہا
عصمت کے بدلے روٹی دی اور اُس کو بھی احسان کہا
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا ، جب جی چاہا دھتکار دیا
عورت سنسار کی قسمت ہے، پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اُگے کونپل بن کر اس تن کو ذلیل وخوار کیا

ساحر لدھیانوی نے مردوں کے غلبے وتسلط والے معاشرہ پر گہرا طنز اپنی نظموں ونغموں میں کیا۔ان کے یہ اشعار دیکھیے

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
روح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں
کتنی صدیوں سے یہ وحشت کا چلن جاری ہے

کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ گناہوں کا رواج
لوگ عورت کی ہر اک چیخ کو نغمہ سمجھے
وہ قبیلوں کا زمانہ ہو کہ شہروں کا رواج

شاعر ساحر نے صرف خواتین پر ظلم وجبر کی عکاسی ہی اپنی شاعری میں نہیں کی بلکہ انھیں نزاکت چھوڑ کر نئی دنیا کے تقاضوں کے مطابق طاقت وہمت پیدا کرنے کی تلقین بھی کی۔ ان کے ان اشعار پر غور فرمائیے۔

اتنی نازک نہ بنو، اتنی نازک نہ بنو
حد کے اندر ہو نزاکت تو ادا ہوتی ہے
حد سے بڑھ جائے تو آپ اپنی سزا ہوتی ہے
جسم کا بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا تم سے
زندگانی کا کڑا بوجھ سہوگی کیسے!
اتنی نازک نہ بنو، اتنی نازک نہ بنو

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ساحر لدھیانوی نے خواتین کے متعلق ایسی شاعری کیوں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھیں دنیا میں اگر کسی عورت سے سچی و دلی محبت تھی تو وہ تھیں ان کی مظلوم اور شوہر سے ٹھکرائی ہوئی ماں سردار بیگم جنھوں نے 8 مارچ 1921 کو اپنے بیٹے عبدالحئی کو جنم دیا تھا۔ جو دنیا میں ساحر لدھیانوی کے نام سے مشہور ومقبول ہوا۔ اسے حسن اتفاق ہی کہیے کہ خواتین پر ظلم وجبر اور ان کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے والے ساحر لدھیانوی کا یوم پیدائش ہی عالمی پیمانے پر 8 مارچ کو یوم خواتین کی شکل میں منایا جانے لگا۔ ساحر کے والد جاگیردار فضل محمد نے گیارہ شادیاں کیں لیکن اولاد نرینہ صرف گیارہویں بیوی یعنی ساحر کی والدہ سے ہوئی۔ فضل محمد دیگر جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرح اپنی بیویوں کو لونڈی اور غلام سمجھتے تھے۔ لہٰذا ساحر لدھیانوی کی والدہ اس ظلم واستحصال کے خلاف بطور احتجاج ان سے علاحدہ ہوگئیں اور لدھیانہ میں اپنے بھائی کے گھر رہنے لگیں۔ فضل محمد نے ساحر کو حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا تو جج نے 10 سالہ عبدالحئی یعنی ساحر سے دریافت کیا کہ وہ ماں یا باپ میں سے کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو ساحر نے رئیس باپ کے ساتھ نہیں بلکہ غریب ماں کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن والدہ نے انھیں تعلیم سے آراستہ کیا۔ کالج میں تعلیم کے دوران ہی ساحر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے اور ایک انقلابی شاعر بن گئے۔

ساحر کو اپنی والدہ سے اتنی محبت تھی کہ فلمی دنیا کی ایک غیر مسلم مشہور گلوکارہ کو جب اس خوبرو شاعر سے عشق ہوگیا اور ساحر نے اس کے ساتھ شادی کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار ماں سے کیا تو سخت مذہبی والدہ نے یہ شرط رکھی کہ گلوکارہ اپنا دھرم چھوڑ کر مشرف بہ اسلام ہوجائے۔ چونکہ ساحر اشتراکی تھے اور مذہب کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے والدہ کا احترام کرتے ہوئے گلوکارہ سے شادی تو نہیں کی لیکن اس سے مذہب تبدیل کرنے کے لیے بھی نہیں کہا اور کنوارے ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے اس طرح خواتین کے لیے ان کے دل میں جو عزت اور ہمدردی تھی اس کا پرتو ہمیں ساحر کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان جیسے ادیبوں اور شعراء کی ترغیب وتلقین کی بدولت ہی مردوں کی بنائی ہوئی غیر انسانی رسموں اور عقیدوں سے ہندوستانی خواتین کو کچھ نجات ملی اور حکومت نے بیویوں کو ان کے ظالم شوہروں کے ظلم سے بچانے کے لیے پولیس کے محکمے میں ویمن سیل اور خواتین کی شکایتوں کے لیے تھانے قائم کیے، 'بیٹی بچاؤ اور بیٹی پڑھاؤ' جیسی تحریک شروع کی، جمہوری اداروں میں خواتین کے لیے نشستیں محفوظ کیں۔ یہاں تک کہ مرکزی حکومت میں ایک وزارت خواتین کو بااختیار بنانے کے لیے تشکیل دی گئی۔

یکم مارچ یعنی ساحر کے یوم پیدائش پر ساری دنیا میں یوم خواتین منایا جاتا ہے۔ گزشتہ سال 8 مارچ یعنی 2022 میں ساحر لدھیانوی کی 100 ویں یوم سالگرہ پر نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں ساحر صدی کی تقریبات دھوم دھام سے منائی گئیں اور ان سے متعلق کتب شائع کی گئیں۔ یہ حقیقت قابل فخر ہے کہ اُردو ہندی میں دیوانِ غالب کے بعد سب سے زیادہ شاعری کی کتب ساحر لدھیانوی کی ہی شائع ہوئیں۔ ساحر کے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالات لکھ کر کئی طلبا وطالبات نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ حکومت ہند نے انھیں پدم شری کا اعزاز دیا تو وہ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے بھی نوازے گئے۔ پنجاب کی ایک زرعی یونیورسٹی نے اپنی تیار کردہ ایک پھلواری کے پھول کا نام 'گل ساحر' رکھا۔ اسی طرح ممبئی میں ایک چوراہے کا نام 'پدم شری ساحر لدھیانوی چوک' رکھا گیا۔ لدھیانہ کی ایک سڑک کو بھی ساحر کے نام سے منسوب کیا گیا۔ ساحر لدھیانوی کے انتقال کو تقریباً 42 سال گزر گئے لیکن آج بھی کروڑوں مرد وخواتین ان کے شیدائی ہیں۔ لہٰذا ہم بھی خواتین پر ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھانے والے اس شاعر ساحر لدھیانوی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ ہر اک پل کے شاعر تھے

Sana Asad
97-F, Sector 7
Jasola Vihar, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob: 9971465648

اعترافِ ہنر

شہپر شریف

ڈاکٹر ساجدہ قریشی کی فرہنگ باغ و بہار کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر ساجدہ قریشی کا شمار عہدِ حاضر کی معتبر اور مستند فرہنگ نویس میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی کئی فرہنگیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں فرہنگِ کلیاتِ انشاء، فرہنگِ باغ و بہار، فرہنگِ توبۃ النصوح اور ایک موضوعاتی فرہنگ ''تلمیحاتِ انشاء مع شخصیات'' نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے ناول ابن الوقت کی لفظیات پر مبنی اُن کی فرہنگ ''فرہنگِ ابن الوقت'' عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ مولوی نذیر احمد کے تمام ناولوں کا بہ غائر نظر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بہ اعتبارِ زبان و بیان اُن کے ہر ناول کا اسلوب بڑی حد تک مختلف ہے۔ اگر اُن کے ہر ناول کی الگ الگ فرہنگیں مرتب ہوجائیں تو اُردو زبان کے دامن کو مختلف قسم کے محاورات، روزمرہ، اصطلاحات، کہاوتوں اور ضرب الامثال سے مالا مال کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ساجدہ قریشی کو مولوی نذیر احمد کی زبان دانی نے اس قدر متاثر کیا ہے کہ اُنھوں نے یکے بعد دیگرے اُن کے ساتوں ناولوں کی فرہنگیں مرتب کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے۔ یہ خبر بھی خوش کُن ہے کہ ''فرہنگِ مراۃ العروس'' بھی تکمیل و تزئین کے آخری مرحلے میں ہے۔

میر امن دہلوی کی شہرہ آفاق داستان ''باغ و بہار'' کی لفظیات پر مبنی ڈاکٹر ساجدہ قریشی کی مرتب کردہ فرہنگ ''فرہنگِ باغ و بہار'' کا شمار اہم اور

منفرد حیثیت کی حامل فرہنگ میں کیا جاتا ہے۔معانی ومفاہیم اور اندازِ ترتیب کے اعتبار سے یہ فرہنگ دیگر فرہنگوں سے واضح طور پر منفرد ہے۔

باغ و بہار کی شہرت ،مقبولیت اور عظمت کا انحصار اُس کے خاص و منفرد اسلوبِ نگارش ہی کے سبب ہے۔میر امن نے اپنے پیش رو اور ہم عصر قلم کاروں اور داستان نگاروں کے فارسی آمیز اندازِ تحریر، دوراز کار تشبیہات، گنجلک استعارات اور صنائع و بدائع کی بھرمار سے انحراف کرتے ہوئے سے صاف ،سادہ ، عام فہم اور بامحاورہ زبان میں قلم بند کیں ہے۔وہ خود غ و بہار' کے آغاز میں اس کا سببِ تالیف اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''اب خداوندِ نعمت، صاحبِ مروت، نجیبوں کے قدردان، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تلک گنگا جمنا ہے، لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں ، جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے ، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکمِ حضور کے، میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔''

(باغ و بہار، مرتب رشید حسن خاں صفحہ 11، 1987)

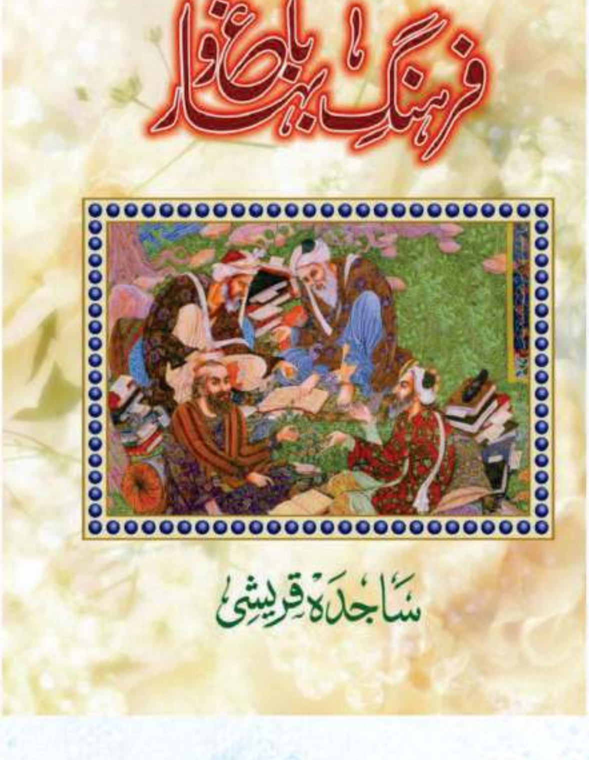

کتابی زبان کے بجائے گفتگو یا عام بول چال کے انداز میں تحریر کی گئی نثر کی یہ پہلی کتاب اس لیے بھی اہم اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ اپنے عہد کے رسم و رواج ، آداب و مراسم اور تہذیب و ثقافت کی بھی عکاس و ترجمان ہے۔موقع و محل کے اعتبار سے استعمال کیے گئے روزمرہ، محاوروں اور کہاوتوں کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ کا بھی یہ بہترین نمونہ ہے۔اس لیے اس کی فرہنگ کا مرتب کیا جانا ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر تھا۔ڈاکٹر ساجدہ قریشی نے ''باغ و بہار'' کی فرہنگ مرتب کر کے ایک ادبی ولسانی ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ اُنھوں نے یہ فرہنگ اس لیے بھی مرتب کی ہے کہ اُردو کی بیشتر کتب لغات اور فرہنگوں پر شعری سرمایہ کا اثر دَورِ قدیم سے دَورِ حاضر تک برقرار ہے۔کسی لفظ یا محاورے وغیرہ کے معنی یا مفہوم کے لیے عام طور پر بطورِ سند شعرا ہی کے کلام کو پیش کیا جاتا ہے۔شعرائے کرام کے کلام پر مبنی فرہنگوں کی تعداد کی بہ نسبت نثر نگاروں کی تخلیقات سے متعلق فرہنگیں برائے نام نظر آئیں گی۔کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ تمام شعری نگارشات میں اب تک ایسے بے شمار الفاظ استعمال نہیں کیے گئے ہیں جنھیں نثری فن پاروں میں استعمال کیا جا چُکا ہے۔خود میر امن کے ذریعہ استعمال کیے گئے بہت سے الفاظ شعری نگارشات اور کُتبِ لغات میں نظر نہیں آئیں گے۔

مطالعہ کی سہولت کے پیشِ نظر اس فرہنگ کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔بابِ اول کے پہلے حصہ میں لغت اور فرہنگ کے فرق و امتیاز کو اس لیے واضح کیا گیا ہے کہ بعض لغت نویسوں نے لغت اور فرہنگ کے مفہوم کو گڈمڈ کرتے ہوئے کتابِ لغت کو فرہنگ کے نام سے منسوب کر دیا ہے جیسے ''فرہنگِ آصفیہ'' ۔دراصل ایک کتابِ لغت ہے نہ کہ فرہنگ۔اُنھوں نے اسی باب کے دوسرے حصے میں ''اُردو میں فرہنگ نویسی : ایک جائزہ'' کے عنوان کے تحت فرہنگ نویسی کی روایت کا تفصیل سے جائزہ بھی پیش کیا ہے ۔بابِ دوم کے پہلے حصے میں ''نثری ادب کی فرہنگوں کی اہمیت اور ضرورت'' کے عنوان کے تحت اُنھوں نے نثری فن پاروں کی فرہنگیں مرتب کرنے کی طرف فرہنگ سازوں کو اس طرح متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے:

''لغت کے مرتبین نے نثری سرمایہ کو نظرانداز کرتے ہوئے شاعری اور بالخصوص غزل گو شعراء کے دوادین میں شامل الفاظ پر نہ صرف اکتفا کیا ہے بلکہ اُنھیں کو بطورِ سند بھی پیش کیا ہے۔کسی نے اب تک یہ محسوس نہیں کیا کہ اُردو کا نثری سرمایہ ایسے بے شمار الفاظ سے بھرا پڑا ہے جن کے مفہوم کو دوسرے الفاظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے جو خوبی ان میں مضمر ہے۔

انہیں گمنامی سے نکال کر کام میں لانے کی ضرورت ہے۔''

(صفحہ 48)

''باغ و بہار'' کے اسلوب اور لسانی مطالعہ کے اعتبار سے اس فرہنگ کا بابِ سوم نہایت اہم ہے۔ اس باب میں ''باغ و بہار'' کے لسانی رویے کے تحت زبان بہ اعتبارِ کردار، محاورات، کہاوتیں اور ضرب الامثال، مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی، تابع مہمل، لفظی تکرار، قریب المفہوم اور ہم معنی الفاظ، متضاد الفاظ، مرکبات، خالص ہندی الفاظ، اشعار، کبت اور دوہرے وغیرہ کے استعمال کی نشان دہی مع مثال کی ہے جس کے متعلق وہ صفحہ 65 پر اس طرح رقم طراز ہیں:

''میر امن نے باغ و بہار میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں اُن کی صرف لغوی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے عہد کے سماج کے پوری طرح عکاس بھی ہیں۔ اگر باغ و بہار کے کرداروں کی زبان اور لب و لہجہ کا مطالعہ کیا جائے تو عمر، جنس، موضوع، مذہب، مقام وغیرہ کے اعتبار سے اُن میں نمایاں فرق نظر آئے گا۔''

چونکہ ''باغ و بہار اور اس کے بعض حصے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس لیے طلباء کی سہولت کے پیشِ نظر ڈاکٹر ساجدہ قریشی نے اس داستان کی تمام عبارت کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے اس فرہنگ کی ترتیب و تزئین نہایت سلیقہ اور ہُنر مندی سے کی ہے۔ سب سے پہلے انھوں ں نے معانی یا مفاہیم طلب الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، اصطلاحات، تلمیحات وغیرہ کا استخراج کیا ہے۔ پھر فہرست سازی کے بعد بہ اعتبارِ حروفِ تہجی اور تلفظ کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے اُنھیں درجِ فرہنگ کیا ہے۔ اُنھوں نے قوسین میں مخففات کے ذریعہ یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ متعلقہ الفاظ کس زبان کے ہیں۔ اس کے بعد معانی یا مفاہیم لکھ کر قوسین میں اسناد یا شواہد کے طور پر اس کتابِ لغت یا فرہنگ وغیرہ کا مخفف نام بھی تحریر کیا ہے جہاں سے اُن کے معانی اخذ کیے ہیں۔ اس کے بعد ''باغ و بہار'' کے متن سے اُس عبارت کو من و عن نقل کیا ہے جس میں معانی طلب لفظ کو میر امن نے تحریر کیا ہے۔ بنیاد بنائے گئے ''باغ و بہار'' کے نسخہ میں مطلوبہ لفظ یا اصطلاح وغیرہ کو بہ آسانی تلاش کیا جاسکے، اُس کے اُس صفحہ نمبر اور سطر نمبر کا بھی اندراج کردیا گیا ہے جہاں سے وہ لفظ یا جملہ وغیرہ اخذ کیا گیا ہے جیسے ''بال باندھی کوڑی مارنا'' اور ''سر سے سر واہ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی'' کے معانی و مطالب:

''بال باندھی کوڑی مارنا'' کے بعد قوسین میں (د) کا اندراج ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ لفظ دیشی یا ہندوستانی ہے۔ اس کے بعد اس جملہ کے معانی قادر انداز ہونا، نشانہ خطانہ کرنا، تیر بہدف لگانا، بے چوٗ کے اور ٹھیک نشانہ مارنا، تحریر کرنے کے بعد قوسین میں (ف آ) کا اندراج ہے جو فرہنگِ آصفیہ کا مخفف ہے یعنی اس جملہ کے معانی فرہنگِ آصفیہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ...... اور پانچ سو سپاہی برقنداز جو بال باندھی کوڑی ماریں، مسلح میرے ہم راہ کر دیے۔ (13-141)۔ قوسین میں (13-141) کے اندراج سے مُراد یہ ہے کہ ''باغ و بہار'' کے بنیادی نسخہ میں یہ جملہ صفحہ 141 کی سطر 13 میں تحریر ہے۔

اسی طرح ایک کہاوت ''سِر سے سِر واہ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی'' کا مفہوم ''اُردو کہاوتوں کی جامع فرہنگ سے اخذ کرکے اس کا اندراج اس طرح کیا گیا ہے: سِر سے سِر واہ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی (د) گھر کے مالک سے گھر کا انتظام ہُوا کرتا ہے، غیر سے نہیں۔ (ج ف) جب سردار مارے گئے، لشکر تتر بتر ہوگیا؛ وہ کہاوت ہے: سِر سے سِر واہ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی۔ (16-173)

معانی یا مفاہیم طلب جن الفاظ کی صراحت کے لیے لغت اور فرہنگیں ناکافی ثابت ہوئی ہیں اُن کے معانی کی معلومات کے لیے اُنھوں نے ماہرین لسانیات اور اساتذہ سے رابطہ بھی قائم کیا ہے یا سیاق و سباق کی روشنی میں اُن کے معانی تحریر کیے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے میر امن کی دیگر تخلیقات اور ان کے عہد کی دیگر کتب کا بھی نہایت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ساجدہ قریشی جب کسی قلم کار کی نگارشات کی فرہنگ مرتب کرتی ہیں تو اُس فن پارے، کتاب یا اس سے متعلق مواد کا نہایت گہرائی و گیرائی سے مطالعہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد سیاق و سباق کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ معنی یا مفہوم طلب لفظ، محاورہ یا ضرب المثل پر غور کرنے کے بعد معنی یا مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر میر امن نے ''باغ و بہار'' میں کسی لفظ کو جُداگانہ یا مختلف معانی میں استعمال کیا ہے تو مرتبہ فرہنگِ ہٰذا نے اسے الگ الگ تحریر کرتے ہوئے وہی معانی تحریر کیے ہیں جو سیاق و سباق سے ظاہر ہو رہے ہیں جیسے آپ سے آپ، اور، بھوئی، پروانگی، پنڈت، پھر آنا، پھولنا، تکیہ، جان، جی چاہنا، سنگ، سنگت، معلم، نکلنا، نوبت، نوبت آنا، نوبت پہنچنا، ہاتھ آنا، ہاتھ باندھنا، ہاتھ پڑنا، ہاتھ نہ آنا۔

''باغ و بہار'' میں موقع و محل کی مناسبت سے آدمی اناج کا کیڑا ہے، آدمی کا شیطان آدمی، اَوسر چوٗ کی ڈومنی گاوے تال بے تال، اوٗنٹ چڑھے

کُتا کاٹے، ایک خطا دو خطا تیسری خطا مادر بہ خطا، کُتے کی دُم کو بارہ برس گاڑو تو بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہے، مُردہ بدست زندہ جیسی کہاوتوں، ضرب الامثال اور ابھی دلی دؤر رہے، اؤنٹ کے گلے میں بلی جیسی حکایتی وتلمیحی پس منظر والی کہاوتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ ڈاکٹر ساجدہ قریشی نے تمام کہاوتوں کے مفاہیم کے علاوہ اُن کہاوتوں کے حکایتی پس منظر بھی تفصیل سے تحریر کیے ہیں جن کا تعلق کسی قصہ، کہانی، کتھا، پرکوسلا، تلمیح یا حکایت سے ہے مثلاً ''ابھی دِلی دؤر رہے'' کو اس طرح درج فرہنگ کیا گیا ہے:

ابھی دِلی دؤر ہے (1) ابھی حصولِ مطلب میں کافی دیر ہے۔ ابھی مقصد پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔

اِس تلمیحی ضرب المثل کی نسبت روایت ہے کہ غیاث الدین تغلق کو حضرت نظام الدین اولیاء سے بباطن از حد کدورت ونفرت تھی۔ چناں چہ جس وقت وہ بنگال سے واپس ہُوا تو اُس نے ایک قاصد کے ذریعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے حضور میں پیغام بھجوایا کہ آپ میرے پہنچنے سے قبل دہلی سے چلے جائیں اور اپنے مسکن غیاث پور سے بھی ہاتھ اُٹھائیں۔ آپ نے پیغام کے جواب میں صرف اتنا فرمایا'' بابا ہنوز دلی دور است'' یعنی ''ابھی دلی دور ہے'' مرضیِ مولا کی کس کو خبر؟ غیاث الدین تغلق کو دلی میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اس قصرِ تغلق کے نیچے دب کر مر گیا جو اس کے بیٹے نے افغان پور میں اپنے باپ کے ٹھہرنے کے لیے تعمیر کروایا تھا۔

صاحبِ نجم الامثال یعنی مولوی نجم الدین نے اس حکایت کی وجہِ تسمیہ اس طرح لکھی ہے کہ ایک مرتبہ جہاں گیر نے ایک صبا رفتار قاصد کے ذریعہ اپنی ملکہ نور جہاں بیگم کے پاس کوئی خاص پیغام دہلی میں بھیجا۔ قاصد نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک ہی دن میں لاہور سے دہلی پہنچ جائے گا اور دوسرے دن بادشاہ کی خدمت میں جواب لے کر حاضر ہو جائے گا۔ چناں چہ وہ ایک ہی روز میں دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ راہ میں اُس نے ایک بُڑھیا سے پوچھا کہ دلی یہاں سے کتنی دؤر ہے؟ بُڑھیا بھڑک کر بولی: ''نوج دلی دؤر'' قاصد اُس کا جواب سُن کر یہ سمجھا کہ وہ ''ہنوز دلی دؤر'' یعنی ''ابھی دلی دؤر رہے'' کہہ رہی ہے۔ وہ عہد پورا نہ ہونے کے خوف سے وہیں پر گر کر مر گیا۔ بادشاہ نے دہلی سے پانچ کوس دؤر اُس کا مقبرہ 1123ھ مطابق 1711 میں بنوایا۔ جو اب تک ''پیک کا مقبرہ'' کہلاتا ہے۔ (ج ف) سخی ہونا بہت مشکل ہے، تم سخاوت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے؛ اُس منزل کو کب پہنچو گے؟ ابھی دِلی دور ہے۔ (14-65)

اس فرہنگ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر ساجدہ قریشی نے ہم رشت، ہم قبیل یا ایک ہی زمرے کے ادبی، تہذیبی، ثقافتی الفاظ و اشیاء کی درجہ بندی بھی کی ہے، اس درجہ بندی سے جہاں ڈاکٹر موصوفہ کی وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے وہیں میر امن کی وسیع معلومات کا بھی ایک نظر میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بطور مثال شخصیات والقاب کے تحت 43 نام، پوشاکیں، کپڑے اور اُن کی قسمیں کے تحت 75، پیشے، پیشہ وران، عہدے، عہدیداران اور نوکر چاکر کے تحت 146، اوزار، ہتھیار اور جنگی سامان کے تحت 28 آلاتِ حرب کا اندراج ہے۔ اس درجہ بندی کے دیگر عنوانات اس طرح ہیں:

1- آتش بازی کی قسمیں، 2- پرندے، پتنگے، جانور اور کیڑے مکوڑے، 3- پھل، 4- پھول، 5- تلمیحات، 6- جواہرات، 7- دیگر اشیاء، 8- رشتے، 9- زیورات (گہنے)، 10- سواریاں، 11- غذا (کھانے، جنس، مٹھائیاں وغیرہ اور اُن کی قسمیں)، 12- مقامات۔

ڈاکٹر ساجدہ قریشی بخوبی واقف ہیں کہ بعض نامانوس، متروک یا قدیم اشیاء کی ہیئت وخصوصیات کو الفاظ کے ذریعہ بخوبی واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اُنھوں نے اس قسم کی اشیاء کی ہیئت وخصوصیت کو فرہنگ میں واضح کرنے کی کوشش تو کی ہے اس کے علاوہ وضاحت طلب آفتابہ، پان دان، پشواز، پکھاوج، پیک دان، پھینٹا، تبر، چلمچی، کُرتی، نیمہ آستین جیسی اشیاء کی تصاویر کا اہتمام بھی کیا ہے۔

فرہنگِ باغ و بہار کے جائزے کے بعد بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ترتیب و تزئین کے اعتبار سے یہ فرہنگ سازی کا ایک ایسا دل کش نمونہ ہے جسے تیار کرتے وقت فرہنگ سازی کے اصولوں سے قطعی انحراف نہیں کیا گیا ہے۔ اس فرہنگ میں روزمرہ، محاوروں اور کہاوتوں کے برمحل استعمال کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ اصطلاحات، تلمیحات، دیومالائی کرداروں اور اساطیری واقعات وقصص سے واقف کرانے کی بھی سعی کی گئی ہے اور معانی یا مفاہیم طلب الفاظ کے مختلف وقوع ومحل پر استعمال کی کثیر معنویت کو بھی نہایت سلیقہ سے واضح کیا گیا ہے۔

□□□

Shahpar Shareef
Jain Mandir Street
Phoota Mahal
Rampur-244901 (U.P)
Phone : +91 9027699292
E-mail : shahpar.shareef@yahoo.co.in

حسنِ سخن

عرش منیر

یوم خواتین کے موقع پر

اے بنت حوا نظام گلشن پہن کے خوش ہے ترا اتارا
کہیں پہ تو رنگ وبوئے گل ہے کہیں پہ بجلی کہیں پہ تارا
کہیں پہ ہے مہر کی تمازت کہیں پہ ہے ایک ماہ پارا
تو رونق کائنات کا سب سے خوبصورت ہے استعارا

قلم ہے تیرا وجود سارا لہو ترا تیری روشنائی
کبھی ہے بیٹی بہن کبھی ہے کہیں پہ دلہن کہیں پہ مائی
کہیں پہ بصرہ کی رابعہ ہو کہیں پہ مریم کی پارسائی
کہیں پہ رادھا کہیں پہ میرا کہیں شجاعت میں چھمی بائی

ترا ہے مہروخلوص زیور سراپا تو ہے وفا کی ہمدم
تجھی سے برہا کے گیت ابھرے تری ہی سانسیں ملن کا سرگم
تمھی معانی ہو سندرم کے تمھی سے ستیم تمھی سے شیوم
وجود زن سے قسم خدا کی ہے خوبصورت وجود عالم

تمھی کو کہتے ہیں صنف نازک تمھی صدائے کرخت بھی ہو
ترے ہی دم سے چراغ محفل بھی نخوت تاج وتخت بھی ہو
ہے تم پہ بنیاد قصر ہستی تمھی دل لخت لخت بھی ہو
تمھی کو ویراں کرے ہے دنیا نظر میں تم سبز بخت بھی ہو

مگر کبھی یہ نہ بھول جانا سبھی سے برتر ہے تیری عظمت
ہے تجھ سے سارا غرور انساں ترے ہی زیر قدم ہے جنت

Dr. Arshe Moneer
61D, Linton Street
Kolkata-700014 (W.B)

غزلیں

ریشما زیدی

یہ ادب کا ہے سفر اور سفر میں ہوں میں
بن کے الفاظ تری راہ گزر میں ہوں میں

میں ہوں وہ خاک دعاؤں نے اڑایا جس کو
اب وہاں ہوں کی ستاروں کی نظر میں ہوں میں

میں جلی شمع سی تو شام نے تھاما دامن
اب مرا کوئی نہیں ہے کہ سحر میں ہوں میں

میں وہی کشتی ہوں ہاں ہاں وہی بے بس کشتی
کل تھی طوفاں میں گھری آج بھنور میں ہوں میں

کون سی شے مہ تاباں کیے جاتی ہے مجھے
رات اتنا تو بتا کس کے اثر میں ہوں میں

میری قسمت میں یہ گہرائی سدا تھی ریشم
ہاں جگر میں تھی کہ اب درد جگر میں ہوں میں

Reshma zaidi
House No 572 Janta Flates
G.T.B.Enclave
Near Nootan Vidhya Mandir School
Delhi-110093

خوشبو پروین

فریب کار سے کب تک فریب کھاؤں گی
اشارتاً اُسے سمجھا کے ہار جاؤں گی

تمھیں جب اپنی زباں کا کوئی لحاظ نہیں
میں اپنا عہدِ وفا کس طرح نبھاؤں گی

اسے ہے زعم مکمل ہے ہر لحاظ سے وہ
تو پھر ضرور کبھی آئینہ دکھاؤں گی

ہوں ہوشیار! مری پشت کی طرف والے
مقابلے کے لیے سامنے بھی آؤں گی

کرخت بولی سے کب تک کروگے خوف زدہ
نسائی لہجے کو ہتھیار میں بناؤں گی

کھلی فضا میں تو ملنا محال ہے میرا
تُو میرا دھیان لگا،خواب میں میں آؤں گی

مری تلاش میں خوشبو ہوا ہے وہ پاگل
میں بس مہکتی رہوں گی ،اُسے ستاؤں گی

Ms. Khushboo Perween
K-12 Third Floor,Haji Colony
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
New Delhi-110025
Mob: 7644096273

کہانی

دوسرا بابل

شہانہ اقبال

یحییٰ ایک ساٹھ سالہ رئیس تھا، باپ دادا سے بے حساب دولت ملی تھی، جسے اُس نے جوانی میں دو دو ہاتھوں سے لٹایا تھا، شراب اور شباب کی لت نے نہ صرف اس کے اثاثے کو محدود کر دیا تھا بلکہ وہ خود کسی عورت کے قابل نہ رہا، جوانی کی عیاشیاں ختم ہوئیں تو اس کے پاس سوائے پچھتاوے کے کچھ نہ بچا، یہ سوال رہ رہ کر اُسے پریشان کر رہا تھا کہ جوانی میں کیا کیا؟ ایک عدد شادی بھی نہیں کی کہ کسی گرتی دیوار کا سایہ ہی نصیب ہوتا اور وہ اپنا بڑھاپا سکون سے گذار سکتا، اسی فکر نے کمر کچھ اور جھکا دی کہ ضعیفی کا یہ دور کس کے سہارے گذارے گا؟

رشید اس کے بچپن کا دوست تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ اس کے پڑوس میں رہتا تھا، اس کی ایک بیٹی تھی جو شادی کے بعد سسرال میں خوشگوار زندگی گذار رہی تھی، وظیفہ کے بعد رشید کا زیادہ تر وقت یحییٰ کے ساتھ ہی گزرتا، اکثر دونوں کے درمیان گپ شپ ہوتی، ہنسی مذاق ہوتا، کبھی کبھی شطرنج کی بساط بھی بچھ جاتی۔

ایک دن اچانک پیر پھسلنے سے یحییٰ غسل خانہ میں گر پڑا، پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی، بیس پچیس دن چار پائی پر پڑا رہا، ان دنوں ایک پڑوسی اور دوست ہونے کے ناطے رشید نے اس کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کی، اس کی بیوی کے ہاتھ کا پکایا ہوا گرما گرم کھانا کھا کر یحییٰ کو اپنی محرومی کا کچھ زیادہ ہی احساس ہوتا اور بڑی حسرت سے کہتا ''یار رشید! تو ہے بڑے نصیب والا، تینوں وقت بھابی کے ہاتھوں کا بنا مزیدار کھانا کھاتا ہے۔''

''تجھے کس نے منع کیا ہے؟ اگر تو چاہے تو' تو بھی بیوی کے ہاتھ کا بنا کھانا کھا سکتا ہے۔'' رشید نے بڑے خلوص اور مشفقانہ انداز میں یحییٰ کو مشورہ دیا۔

''کیوں مذاق کرتا ہے یار؟'' یحییٰ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا، ''اس عمر میں مجھے کون بیٹی دے گا؟''

''کون سا تجھے اولاد کے لیے شادی کرنی ہے جو جوانی کے گزر جانے کا ماتم کر رہا ہے؟ اپنی خدمت کے لیے بیوی چاہیے تو کسی غریب گھر کی لڑکی سے نکاح پڑھوالے جو پیٹ بھر روٹی اور تن بھر کپڑے کے عوض تیری خدمت کرنے پر راضی ہو جائے۔'' رشید نے اُسے مشورہ دیا۔

''کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟'' یحییٰ خوشی اور امید کے مارے بستر پر اُٹھ بیٹھا۔

''کیوں نہیں!'' رشید خوش دلی سے ہنسا، ''تو کہہ کر تو دیکھ۔''

رشید کی بتائی ہوئی تجویز یحییٰ کو پسند آئی اور اس نے کسی ایسی ہی لڑکی کی تلاش کی ذمہ داری بھی رشید ہی کو سونپ دی، چار چھ ماہ کی تلاش کے بعد رضیہ سامنے آئی، سانولا رنگ، سڈول جسم اور درمیانی قد والی ایک غریب لڑکی جس کا باپ کئی سال پہلے مر چکا تھا، بیوہ ماں اور چھوٹے چھوٹے دو بھائی تھے، ماں دن بھر گھر گھر جا کر برتن مانجھ کر جو کچھ لاتی اس میں ایک وقت بھی چاروں کا پیٹ نہیں بھرتا، پہاڑوں کے اس پار حکومت نے نئی بستیاں آباد کرنے کے لیے کچھ زمین مفت دی تھی، اسی پر جھونپڑی

ڈال کر زندگی کے دن گزار رہے تھے، پندرہ سالہ رضیہ کی ماں اس کی بڑھتی عمر اور اپنی گھٹتی زندگی سے پریشان تھی، دن رات اسی فکر میں رہتی کہ رضیہ کا ٹھکانہ ہو جائے تو وہ بیٹیوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح جی لے گی، اسی فکر نے اُسے وقت سے پہلے بوڑھا اور بیمار کر دیا تھا۔

رشید کی سرپرستی میں محلے کے کچھ لوگوں کی موجودگی میں رضیہ اور یحیٰ کا نکاح ہو گیا، رشید نے رضیہ اور اس کی ماں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ روٹی اور کپڑے کے ساتھ ساتھ رضیہ کو رہنے کے لیے مکان بھی میسر ہوگا، لیکن اس کے عوض اُسے یحیٰ کی خدمت گزار لونڈی بن کر رہنا ہوگا، وہ شوہر ثابت ہو نہیں سکتا، لہٰذا رضیہ بیوی بننے کی کوشش نہ کرے، ماں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی چپ سادھ لی اور بے چاری رضیہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ جب لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو وہ جی جان سے شوہر کی خدمت کر کے اس کا دل جیت لیتی ہے۔

رشید اور اس کی بیوی کے ساتھ رضیہ، یحیٰ کے گھر پہنچی، دو کمرے اور بڑے سے آنگن والا گھر دیکھ کر رضیہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی، اپنی چھوٹی سی جھونپڑی کے آگے اُسے یہ گھر کسی محل سے کم نہیں لگا۔

گوٹے کنارے والے سرخ جوڑے اور چاندی کے اُجلے زیور پہن کر رضیہ کا سانولا حُسن نکھر آیا تھا، نئے ماحول میں وہ کچھ ڈری ڈری اور سہمی سی لگ رہی تھی، رشید کی بیوی اُسے کمرے میں بڑی چارپائی پر بٹھا کر رخصت ہوئی، تھوڑی دیر بعد یحیٰ کمرے میں داخل ہوا، رضیہ فوراً پلنگ سے اُٹھی اور اس کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے اس کے دونوں پیر پکڑ لیے، اس اچانک افتاد پر وہ قدرے پریشان ہوا اور اپنے قدموں میں بیٹھی رضیہ کو اٹھا کر پلنگ پر بٹھایا اور خود بھی اس کے بازو میں بیٹھ گیا، رضیہ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان بولی:

''میں جی جان سے تمھاری خدمت کرلوں گی، تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی، لیکن اس کے بدلے میں تم سے کچھ مانگتی ہوں۔''

''تم پہلے یہ رونا بند کرو! لو تھوڑا پانی پی لو۔'' یحیٰ نے پاس رکھی صراحی سے انڈیل کر پانی سے بھرا گلاس اُسے دیا۔

رضیہ پانی پی چکی تو یحیٰ نے پوچھا: ''بولو! کیا چاہتی ہو؟''

پوچھنے کو تو اس نے پوچھ لیا' لیکن دل ہی دل میں لرز رہا تھا کہ پتہ نہیں رضیہ کیا مانگ بیٹھے؟

یحیٰ کی نرمی کو محسوس کر کے رضیہ کے آنسو رک گئے اور وہ پُر امید نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی: ''پہلے تم بولو کہ انکار نہیں کرو گے؟''

''تم بولو تو سہی! میرے بس میں ہوا تو ضرور تمھاری بات مانوں گا۔'' یحیٰ کی نرمی برقرار تھی۔

''میری ماں اور چھوٹے چھوٹے بھائیوں کا بُرا حال ہے، اگر کچھ دن اور یہی حال رہا تو وہ لوگ فاقوں سے مر جائیں گے، انھیں پیٹ بھر روٹی دو! میں بھوکی رہ کر بھی تمھاری خدمت کرلوں گی۔'' رضیہ سرتاپا التجا نظر آ رہی تھی، وہ درد بھری آواز میں بولی۔

''اچھا! اچھا!'' یحیٰ کی جان میں جان آئی اور وہ خوش دلی سے بولا: ''جو تمھاری مرضی ہے ضرور کروں گا۔''

یحیٰ اتنی آسانی سے اُس کی بات مان جائے گا اس کا اُسے اندازہ نہ تھا، وہ خوشی سے پھولے نہیں سمائی، پیار برساتی آنکھوں سے یحیٰ کو دیکھتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی، جیسے کوئی نئی نویلی دولہن اپنی دوشیزگی کی تکمیل کے بعد پھولوں کی سیج سے نیچے اُتر آتی ہے۔

رضیہ کا روم روم یحیٰ کا احسان مند ہو گیا، اپنی بیمار ماں اور بھائیوں کی بھوک کے آگے اس نے کچھ سوچا ہی کب تھا، ایک لمبے عرصہ کے بعد رضیہ کو چین کی سانس نصیب ہوئی، رات بھر وہ بڑے آرام کی نیند سوئی، صبح اُس کی آنکھ کھلی تو وہ بڑی تازہ دم تھی، سب سے پہلے اس نے سارے گھر کا جائزہ لیا، دو کمروں والا گھر گرد اور کچرے سے بھرا پڑا تھا، کمروں اور صحن کی صفائی کے بعد وہ باورچی خانے میں آئی، وہاں بھی بے ترتیبی کا راج تھا، پکوان اور کھانے پینے کی چیزیں برائے نام تھیں، دیوار پر کھونٹیوں پر دو تھیلیاں لٹک رہی تھیں، ایک میں چاول اور دوسرے میں کچھ سوکھی ہوئی سبزیاں تھیں۔

یحیٰ کے اٹھنے سے پہلے پہلے اس نے ناشتہ تیار کر لیا تھا، وہ جاگا تو زندگی میں پہلی بار اُسے اندازہ ہوا کہ گھر میں عورت کا وجود بھی کیسی نعمت ہے، وہ گھر جو ازل سے ویران پڑا تھا' رضیہ کے ہاتھوں کا لمس پا کر کیسا آباد آباد لگ رہا تھا۔

ناشتے کے بعد یحیٰ نے رضیہ کو کچھ روپے دیے اور کہا: ''جا کر ماں کو کھانے پینے کی ساری چیزیں خرید کر دے آؤ۔''

یحیٰ کے لیے دوپہر کا کھانا بنا کر وہ اپنی ماں کے گھر گئی، سب سے پہلے وہ بازار سے ضرورت کی کچھ چیزیں اور اناج خرید لائی، کھانا بنایا اور اپنی ماں اور بھائیوں کو پیٹ بھر کھانا کھلا کر اپنی ماں کو ڈاکٹر کو بتایا اور اس کے لیے دوائیاں لے آئی، واپس آئی، یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ کسی شفیق باپ کی طرح خوش تھی جو اپنے خون پسینے کی کمائی اپنی بیوی اور بچوں پر خرچ کر کے ہوتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گھروں کا نقشہ بدل گیا، یحییٰ خوش تھا کہ عورت کی جس خدمت گزاری اور وفاشعاری سے وہ عمر بھر محروم رہا وہ اُسے اپنی امید سے کہیں زیادہ مل رہی تھی، رضیہ ایک جاں نثار ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتی، ایک شفیق بہن کی طرح اس پر نچھاور ہونے کو تیار رہتی، ایک فرمانبردار بیٹی کی طرح اس کی خدمت کو آمادہ رہتی، کسی مرد کو اگر عورت کے یہ تین روپ میسر ہوں تو پھر اس کی خوش بختی کا کیا کہنا، رہا عورت کا چوتھا روپ بحیثیت بیوی کے، تو وہ خود اس کے قابل نہ تھا، وہ رضیہ کی عظمت کا دل سے قائل تھا کہ اس نے کبھی اشاروں اور کنایوں میں اُسے اس بات کا احساس دلانے کی بھی کوشش نہیں کی۔

رضیہ بھی بے انتہا مسرور تھی، ماں کی صحت اور بھائیوں کے مطمئن چہرے دیکھ کر اُسے اپنے آپ پر پیار آتا، ایک بے مصرف اور مایوس زندگی گزار رہی تھی، وہ سوچتی کہ نہ وہ پڑھی لکھی تھی کہ ملازمت کر کے ماں اور بھائیوں کا پیٹ بھر سکتی اور نہ ہی اتنی خوبصورت کہ کوئی راج کمار اُسے بیاہ کر راج محل لے جاتا، ایک خدمت گزاری کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس کی بدولت سارا کنبہ آرام کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

وہ گھر کے سارے کام پوری توجہ اور دلچسپی سے کرتی، یحییٰ کی ہر ضرورت کا خیال عبادت کے درجے میں رکھتی، رضیہ کی عقیدت میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا، جس سے یحییٰ انجان نہ تھا، گو کہ اس عقیدت کا کوئی بدل نہ تھا، لیکن یحییٰ بھی رضیہ کی ضرورتوں اور خوشی کا پورا خیال رکھتا، ہر ماہ رضیہ کو ایک بندھی رقم دیتا کہ وہ ماں کو دے آئے۔

رمضان کی چاندرات رضیہ کے لیے بے حد خوش کُن ثابت ہوئی، وہ عید کی تیاری میں مصروف تھی کہ یحییٰ اس کی ماں اور دونوں بھائیوں کو اپنے گھر لے آیا اور اس سے کہا: ''اب یہ تینوں ہمارے ساتھ اسی گھر میں رہیں گے۔''

رضیہ نے حیران اور پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا: ''تم پریشان نہ ہو! ابھی میرے پاس اتنا کچھ بچا ہے کہ تمھارے ساتھ ان تینوں کی ضرورتیں بھی پوری کر سکوں۔''

یحییٰ کے اس احسانِ عظیم پر رضیہ کا دل چاہا کہ وہ اپنی جان دے کر اس کا شکر یہ ادا کرے، اس نے بڑی عقیدت سے یحییٰ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اُن پر بوسہ دیا اور اپنے سر پر رکھ لیا جو اُس کی عقیدت کا کھلا ثبوت تھا۔

ایک گھر میں یحییٰ کا پورا خاندان آرام اور سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا، رضیہ کے دونوں بھائیوں کو یحییٰ نے محلے کے اسکول میں داخل کروا دیا تھا، رضیہ کا دل خوشی سے جھومنے لگتا، جب اس کے دونوں بھائی صبح صبح کاندھوں پر بستے لٹکائے اسکول جاتے، رضیہ کی خود داری کو گوارا نہ تھا کہ یحییٰ اتنے سارے خرچ کا بوجھ اُٹھاتا، اس نے ماں کے ساتھ مل کر گھر میں پھولوں کے گجرے بنانے کا کام شروع کیا، اسکول سے واپسی کے بعد اُس کے دونوں بھائی ان گجروں کو بازار میں بیچ آتے، اس طرح ان کے چھوٹے موٹے خرچ نکلنے لگے، یحییٰ نے ایک کے بعد ایک احسان کر کے رضیہ کو بن داموں خرید لیا تھا، وہ مسحور سی گھر کو جنت بنانے میں مصروف رہتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے چار سال گزر گئے، اچھی غذا، دلی سکون اور خوشیوں کے حصول نے رضیہ کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے تھے، سانولی رنگت میں ایک عجیب سی کشش آگئی تھی کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا، محلّہ کی دو چار خواتین جو رضیہ کی شخصیت کی گرویدہ ہو چکی تھیں اکثر اس کے گھر آیا کرتی تھیں، ان کی سنگت میں رضیہ نے ڈھنگ کا لباس پہننا سیکھ لیا تھا، بول چال بھی پہلے سے بہتر ہو چکی تھی، یحییٰ نے دو چار سونے کے زیور دلوا دیے تھے، جسے پہن کر اُس کا حسن اور بھی نکھر گیا تھا۔

پڑوس میں برسوں سے خالی پڑے مکان میں نئے کرایہ دار آئے تھے، میاں بیوی اور ان کی والدہ، نیا شادی شدہ جوڑا تھا، جن کا کوئی بچہ نہ تھا، گھر آتے جاتے یحییٰ سے علیک سلیک ہو جایا کرتی تھی، ایک دن اس نے یحییٰ سے کہا:

''انکل! نئی جگہ آ کر میری ماں اور بیوی بہت اکیلا پن محسوس کر رہی ہیں، اگر آپ اجازت دیں تو یہ دونوں کبھی کبھار آپ کے گھر آپ کی بیٹی سے ملنے آجایا کریں یا پھر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی بیٹی کو ہمارے گھر بھیج دیا کریں، میں تو دن بھر گھر سے باہر ہوتا ہوں۔''

یحییٰ نے بغیر کسی وضاحت کے اثبات میں گردن ہلا دی، لیکن ''آپ کی بیٹی'' متوقع پہچان سن کر وہ سر تا پا لرز گیا، کیا واقعی وہ رضیہ کا باپ لگتا ہے؟ اگر نہیں! تو اس کے پڑوسی نے یہ کیوں کہا؟

یحییٰ گھر لوٹ رہا تھا، لیکن اب اس کا دل گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا، وہ بے مقصد ہی بازار کی طرف نکل گیا، بازار میں جہاں بھی کم عمر لڑکی نظر آجاتی پڑوسی کے الفاظ ''آپ کی بیٹی'' یاد آجاتے، کیا اس نے چھوٹی عمر کی لڑکی سے نکاح کر کے ناقابل معافی گناہ کیا ہے؟ اس کا ضمیر اس سے سوال کر رہا تھا، گو کہ وہ رضیہ، اس کی ماں اور اس کے بھائیوں کی کفالت کر رہا تھا لیکن کیا کوئی احسان، بیوی کے حقوق ادا نہ کر سکنے کا ازالہ ہو سکتا ہے؟ رضیہ کب تک حالات سے سمجھوتہ کرتی رہے گی؟ اپنی محرومی کے باعث کہیں اُس نے کوئی غلط قدم اُٹھا لیا تو ساری ذمہ داری اسی پر آئے گی اور خدا کے ہاں وہ پکڑا جائے گا۔

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور کسی ایک نتیجہ پر پہنچنے کے لیے وہ رشید کے گھر گیا، لیکن رشید گھر پر موجود نہ تھا، اس لیے ملاقات نہ ہوسکی، مضمحل دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ وہ اپنے گھر پہنچا، سامنے ڈوری پر رضیہ دُھلے ہوئے کپڑے پھیلا رہی تھی، بھیگے ہوئے کپڑے جگہ جگہ سے اس کے بدن سے چپک گئے تھے، جس سے اس کے جسم کے نشیب وفراز واضح ہو رہے تھے، بالوں کی گیلی لٹیں اُس کی پیشانی اور گالوں سے چپکی ہوئی تھیں۔

آہٹ پاکر اس نے نظریں اٹھا کر یحییٰ کی طرف دیکھا اور دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور اس کے ہاتھ سے سبزی سے بھرا تھیلا لیتے ہوئے مسکرا کر بولی: ''کہاں رہ گئے تھے؟ بڑی دیر کردی!''

''دیر تو واقعی بہت ہوچکی ہے۔'' یحییٰ نے نگاہوں سے کہتے ہوئے رضیہ کا بھرپور جائزہ لیا اور پہلی بار اُسے محسوس ہوا کہ رضیہ چودھویں کے چاند کی طرح خوبصورت اور مکمل تھی، چاند کے داغ کی طرح اُس کی غربت بھی اس کا داغ تھا، جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے رضیہ کو اپنی خدمت کے لیے اپنے کھونٹے سے باندھ رکھا تھا، احساسِ ندامت سے وہ پسینہ پسینہ ہوگیا، اس کی حالت دیکھ کر رضیہ بڑی پریشان ہوگئی، اس کے ماتھے کو چھو کر پوچھنے لگی:

''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' پھر رضیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے پاس پڑی کرسی پر بٹھا دیا اور دوڑ کر پانی کا گلاس بھر لائی اور پانی پلا کر بولی: ''چلو! تھوڑی دیر آرام کرلو، طبیعت اپنے آپ ٹھیک ہوجائے گی۔''

یحییٰ نے رضیہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بارے میں سوچ جارہا تھا کہ ایسا کیا کرے کہ رضیہ کے ساتھ کی گئی زیادتی کا ازالہ ہوجائے۔

رضیہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں دل کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں، اُسے روٹی، کپڑے اور پناہ کے سوا بھی کچھ اور چاہیے، اپنے موقوف کے ساتھ اس نے رضیہ سے شادی کرکے انسانیت سے گری ہوئی حرکت کی تھی، یحییٰ کو یہ سوچ سوچ کر بڑا پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے رضیہ کے عمر کے چار قیمتی سال ضائع کردئے، اس کی شادی اگر کسی نوجوان مرد سے ہوئی ہوتی تو وہ اب تک دو تین بچوں کی ماں بن جاتی، رضیہ کے بجائے وہ کسی عمر رسیدہ عورت سے بھی نکاح کرسکتا تھا، رضیہ کی زندگی سے کھلواڑ کرنے کا اُسے کوئی حق نہیں تھا۔

برآمدے میں بیٹھا یحییٰ صحن میں اپنے ادھورے کام کی تکمیل کرتی رضیہ کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا، میں ایسا کیا کروں کہ اس معصوم کے ساتھ ناعاقبت اندیشی میں کی گئی زیادتی کی تلافی ہوجائے۔

یحییٰ نے دل ہی دل میں مصمم عزم کرلیا کہ میں رضیہ کی دوسری شادی کرواؤں گا، اس کے لیے مناسب رشتہ تلاش کرکے اسے اپنے آنگن سے بیٹی کی طرح رخصت کروں گا تاکہ اسے وہ سارے سکھ مل سکیں جس کی وہ جائز حق دار ہے۔ اس ارادے کے ساتھ ہی یحییٰ نے بڑی طمانیت محسوس کی، لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے دل میں خدشات نے سر اُٹھانا شروع کردیا۔

لوگ کیا کہیں گے؟ لوگ کچھ بھی کہیں، میں ان کی بالکل پرواہ نہیں کروں گا۔ لوگوں کا کام ہی بھلائی کا کام کرنے والوں کے آگے مورچہ بنا کر کھڑے ہوجانا ہے۔

کیا رضیہ دوسری شادی کے لیے راضی ہوجائے گی؟ یحییٰ کے دماغ میں ایک اور سوال نے سر اُٹھایا، کیونکہ وہ اپنی ماں اور بھائیوں کے لیے اپنے جائز حقوق کی قربانی دے کر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

یحییٰ نے سوچا میں اس کی منت سماجت کروں گا، اُسے یقین دلاؤں گا کہ مرتے دم تک تمھاری ماں اور بھائیوں کی ایک شفیق باپ کی طرح پرورش کروں گا۔

رضیہ کی شادی کے بعد میرا کیا ہوگا؟ یہ سوال بھی رہ رہ کر اُس کے حوصلے پست کرنے لگا۔ میری دیکھ بھال کے لیے رضیہ کے دو بھائی ہی کافی ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جوان ہوجائیں گے، میں اُن کا بیاہ کر بہوئیں گھر لاؤں گا، اس طرح میرا بڑھاپا بھی سنور جائے گا۔

اس خیال کے آتے ہی یحییٰ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور قاضی صاحب سے شرعی مسئلہ کا حل پوچھنے گھر سے نکل پڑا۔

یہ بات اس کے دل میں گھر کرچکی تھی کہ بیٹیاں وہی نہیں ہوتیں جنھیں جنم دیا جاتا ہے؛ بلکہ بیٹیاں وہ بھی ہوتی ہیں جو خدمت اور ایثار سے دلوں میں گھر بنالیتی ہیں۔

□□□

Shahana Iqbaal
Shahana Manzil
H.No:8-1-21/9,
Suriyanagar Colony
Tolichowki,
Hyderbabad-500008 (T.S.)
Cell: 9618559318
E-mail:shahana.khatoon.iqbal@gmail.com

قطع

کوثر سید یوسف

ہمیں معاف کر دیں آپا! ہم آپ سے معذرت چاہتے ہیں۔ جمیل صاحب نے بہت مشکل سے کہا تھا۔

کیا!؟ تم مجھے........... مجھے انکار کر رہے ہو؟ سکینہ نے 'مجھے' پر زور دیا اس کی آواز میں دنیا بھر کی بے یقینی تھی۔

نہیں آپا ہم آپ کو انکار نہیں کر رہیں بلکہ اس بات کا انکار کر رہے ہیں جو ممکن نہیں ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ جمیل صاحب کی زوجہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں......ہم یہ نہیں کر سکتے۔

باقی ہمارا تعلق پہلے جیسا ہی رہے گا۔ ہمارا اور آپ کا رشتہ بہت خوبصورت ہے آپا، بلکہ میں تو آپ کو اپنی بڑی بہن کا درجہ دیتی ہوں......

کیا کروں گی میں ایسے درجے کا؟ جس میں میرا کوئی مان ہی نہ رکھا جائے۔ سکینہ نے غصے سے اس کی بات کاٹی، کیا فائدہ ایسے رشتوں کا......؟ جہاں میری باتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے وہاں مجھے کوئی رشتہ بھی نہیں رکھنا......! سکینہ نے ایک جھٹکے سے کہا۔ آپا......! جمیل صاحب نے بے ساختہ سکینہ کو دیکھا۔

آج سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے......میں تم سے اپنا رشتہ توڑتی ہوں جمیل......مر گیا میرا بھائی اور مر گئے اس سے جڑے تمام رشتے۔ سکینہ کی آنکھوں میں غصہ ابل رہا تھا۔

شادی ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، ہر سمت گویا رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کہیں سے زوردار قہقہوں کی گونج اٹھتی تو کبھی دھیمی دھیمی سرگوشیاں ابھر ابھر کر معدوم ہو جاتی۔

نئے رشتے بننے جا رہے تھے، نئے خواب سجائے جا رہے تھے۔

بڑے سے ہال میں جگمگاتے فانوس اور لوگوں کے ہنستے مسکراتے چہرے، ہر سوں رونق ہی رونق پھیلی ہوئی تھی۔

دلہن اسٹیج پر براجمان سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرا میک اپ سے مزید خوبصورت لگ رہا تھا، گویا تازہ دم کھلا ہوا گلاب ہو۔

اس پر رونق محفل میں درخشاں ناز واحد تھی جو کونے میں ایک کرسی پر بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ وہ نظریں ہیر پھیر کر اطراف کا جائزہ لینے لگی، جائزے میں کوئی جان پہچان کا نکل آتا تو اسے دیکھ کر مسکرا کر سر کے خم سے سلام کرتی اور دوسری جانب دیکھنے لگ جاتی۔ اس کے انداز میں اکتاہٹ واضح تھی۔

امی! ہم گھر کب جا رہے ہیں؟ درخشاں نے جماہی روکتے ہوئے پوچھا۔

ارے! ابھی تو ہم آئے ہیں اور تم گھر جانے کی بات کر رہی ہو؟ درخشاں کے برابر میں بیٹھی ہاجرہ نے جواباً اسے گھورا۔

بیچ! کتنا بورنگ فنکشن ہے یار امی! وہ جھنجلائی، اسی لیے مجھے آپ کے ساتھ گھریلو فنکشنز میں جانا پسند نہیں، جہاں اپنا تو کوئی نظر بھی نہیں آتا بس اجنبی چہروں کو دیکھ کر خود کے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجانا پڑتی ہے......اونھ! اس نے عجیب بے زاری سے کہا۔

کون اپنا نہیں ہے یہاں؟ سب اپنے ہی تو ہیں۔ دیکھو ہاجرہ نے وہاں موجود مہمانوں کی جانب اشارہ کیا، یہاں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سب کہیں نہ کہیں سے ہمارے رشتے دار لگتے ہیں، کوئی خالہ ہے تو کوئی کچھ۔ اور یہ سب ہمارے اپنے رشتے ہی تو ہیں۔ چلو جاؤ اپنی ہم جولیوں کے ساتھ باتیں کرو اور فنکشن کے مزے لو۔

یوں بوڑھوں کی طرح ایک کونے میں کرسی ڈال کر بیٹھو گی تو بور تو ہو گی ہی نا۔ چلو اٹھو شاباش......! درخشاں ان کے کہنے پر بے دلی سے اٹھ گئی، لیکن اب کہاں جائے اور کیا کرے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ پانی پینے واٹر کولر کے قریب آ گئی۔

پھوپھی ماں! درخشاں کا چہرہ ایک دم سے کھل اٹھا تھا۔ اسے وہاں اس کی پھوپھی ماں نظر آئی جو ایک خاتون کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔

سلام پھوپھی ماں! کیسی ہیں آپ؟ درخشاں اپنی پھوپھی ماں کے قریب آئی اور بہت محبت کے ساتھ سلام کر کے خیریت دریافت کی۔

کچھ دیر پہلے کی چھائی ہوئی بوریت اور بے زاری اس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی۔ پھوپھی ماں چند لمحے خاموش کھڑی تیز نظروں سے اسے دیکھے گئیں۔

درخشاں کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر معصوم مسکراہٹ تھی۔

یہ کون ہے؟ پھوپھی ماں کے ساتھ کھڑی خاتون نے دلچسپی سے پوچھا۔

درخشاں نے اسی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ پہلے اس خاتون کو دیکھا پھر اپنی پھوپھی ماں کو کہ وہ اسے متعارف کرائیں گی۔

پتہ نہیں! پھوپھی ماں نے جواباً بے نیازی سے کہا اور اسے نظر انداز کر کے اس کے تاثرات دیکھے بغیر آگے بڑھ گئیں۔ ان کے ساتھ والی خاتون بھی نا سمجھی سے کندھے اچکا کر آگے بڑھ گئیں۔

ہاں! اسے صدمہ پہنچا تھا۔ وہ چند لمحے سانس نہ لے سکی تھی......

درخشاں ناز کے لیے ہال میں موجود ساری روشنیاں ختم ہو گئیں تھی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ بے یقینی و سکتے کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ سے ایک موٹا آنسو ٹوٹ کر گرا۔

درخشاں نے بے چینی سے ہال میں نظریں دوڑاتی اور اپنی اس پھوپھی ماں کو تلاش کرنے کی کوشش کی، وہ کہیں نہیں تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی وہ پھوپھی ماں جس نے اس کے پھوپھی جان پکارنے پر اسے پھوپھی ماں کہنے کے لیے کہا تھا، آج وہ اسے ایسے نظر انداز کر گئی تھی گویا واقعی ان کا کوئی تعلق نہ ہو اور نہ وہ اسے جانتی ہے۔

اس کی رنگت فق ہو چکی تھی اور آنکھیں پانی سے ڈبڈبانے لگی۔

وہ وہاں سے پانی پیے بغیر ہی واپس لوٹ گئی......

ہاجرہ کے پاس جانے کی بجائے وہ سیدھا باتھ روم کی جانب بڑھ گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی واش بیسن کے قریب رک گئی اور آئینے میں اپنا عکس دیکھے بغیر نل کھول دیا...... پانی اپنی مخصوص آواز کے ساتھ تیزی سے جاری ہو گیا۔ اس نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر اس میں پانی جمع کیا اور یکے بعد دیگرے کئی بار چہرے پر پانی سے بھرا پیالہ انڈیلتیں گئیں......

یہ تمھارے چہرے کو کیا ہوا......سوال میں استفہام سے زیادہ استعجاب تھا۔

درخشاں دوبارہ وہیں آ کر بیٹھ گئی تھی جہاں سے وہ تھوڑی دیر پہلے بے دلی سے اٹھ کر گئی تھی۔ سب ویسا ہی تھا سوائے اس کے......

درخشاں کیا ہوا......طبیعت ٹھیک ہے تمھاری؟ اس کا یوں میک اپ سے خالی دھلا دھلایا شفاف چہرہ دیکھ کر ہاجرہ پریشانی و حیرت سے اٹھ کھڑی ہوئیں تھیں۔

کچھ بولو......؟

درخشاں بظاہر خلا میں گھور رہی تھی لیکن اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔

امی......! بالآخر اس نے لب کھولے، پھوپھی ماں ہم سے ناراض ہیں؟

درخشاں کے سوال نے ہاجرہ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔ ہاجرہ کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر ایک ساتھ لہرائے۔

جواب نہ آنے پر درخشاں نے خلا سے نظریں ہٹا کر اپنی ماں کو دیکھا جو اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی تھیں۔

امی بتایئے نا...... پھوپھی ماں ہم سے ناراض ہیں؟ اس نے اپنا سوال دہرایا۔

تم......تمھاری ملاقات............کب ہوئی آپا سے؟ ہاجرہ کے سوال کے جواب میں درخشاں نے انھیں واٹر کولر کے پاس ہوا سارا

واقعہ کہہ سنایا۔

امی...... میں تو پھوپھی ماں کی گڑیا ہوں نا......! پھر وہ مجھے ایسے کیسے نظرانداز کر گئیں؟ درخشاں کی آواز میں رنج تھا۔

ہاجرہ کرسی پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کی ٹانگیں اس کے سینے میں دفن راز کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔

امی پلیز...... کچھ تو بتائیں! پھوپھی ماں ہم سے ناراض کیوں ہیں؟ درخشاں جواب سننے کے لیے بضد تھی۔

نہیں......! ہاجرہ نے گردن کو نفی میں دائیں بائیں حرکت دیں۔

آپا ہم سے ناراض نہیں ہیں......

وہ ہم سے قطع تعلق کر چکی ہیں۔ ہاجرہ نے اپنا فقرہ توڑ توڑ کر مکمل کیا، برسوں پہلے وہ ہم سے...... رشتہ منقطع کر چکی ہیں!

ک...... کیا!! درخشاں کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

ہاں! جب تم بہت چھوٹی تھی، قریب تیرہ............ چودہ برس کی!

پانچ سال پہلے......! درخشاں نے بہت جلدی جمع تفریق کر دی۔

لیکن کیوں............؟ اور دادی جان...... انھوں نے کچھ نہیں کیا؟

کیا تھا نا............ آپ کے رشتہ توڑنے کے بعد انھوں نے بھی ہم سے رشتہ ختم کر دیا تھا۔ ہاجرہ نے تکلیف سے کہا۔

کیا؟ مم...... مطلب دادی جان نے بھی ہم سے......! اس کی آنکھیں حیرت سے مزید پھیل گئی۔

صرف اماں نے نہیں ...... بلکہ سب نے! ہاجرہ نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔

آخر ایسی کیا وجہ تھی امی کہ سارے رشتے ہی ہم سے قطع ہو گئے؟

درخشاں بنا پلک جھپکائے ہاجرہ کو دیکھ رہی تھی۔

سارے رشتے ایک ساتھ نہیں ٹوٹے تھے۔ صرف ایک رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے...... دوسرے تمام رشتے بھی ٹوٹ گئے! ہاجرہ کے لہجے میں دنیا بھر کا افسوس در آیا تھا۔

کیسا رشتہ......؟ کس کا رشتہ؟

شادی کی تقریب کا سارا منظر ان دونوں کے لیے پس منظر میں چلا گیا تھا اور ماحول پر سکوت چھانے لگا تھا۔

ہاجرہ کے سامنے ماضی کے واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔

مصطفیٰ منزل میں آج خلاف معمول کافی چہل پہل تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے بنائے جا رہے تھے۔ کسی خاص مہمان کی آمد تھی اور تیاریاں عروج پر تھی۔ کل سکینہ کا فون آیا تھا وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے سب سسرالیوں کے ساتھ آج آ رہی ہے۔

خاتون بی نے چہک کر بتایا اور کہہ رہی تھی کہ ہم سب کے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری بھی ہے، مٹھائی تیار رکھیں! خاتون بی کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

مصطفیٰ منزل کے سبھی مکین ''بہت بڑی خوش خبری'' جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ سکینہ خاتون بی اور مصطفیٰ صاحب کی پہلی اور سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ سکینہ کے بعد دو بیٹے جمیل صاحب اور اسلم تھے۔

مصطفیٰ صاحب چند سال ہوئے فوت ہو چکے تھے اور اب مصطفیٰ منزل میں خاتون بی کا راج رہتا تھا۔ گھر کے سبھی افراد ان کے بہت تابع تھے۔

سب تیار ہیں نا؟ خاتون بی نے دریافت کیا، وہ لوگ پہنچتے ہی ہوں گے۔ انھوں نے دیوار پر لگی گھڑی کو بے چینی سے دیکھا، جو دس بجا رہی تھی۔

جی اماں! سب تیار ہے، اب بس آپ کا انتظار ہے۔ اسلم صاحب کی زوجہ طاہرہ نے جواب دیا۔

ہاجرہ! خاتون بی نے جمیل صاحب کی زوجہ کو مخاطب کیا۔

میٹھے میں کیا بنایا ہے؟

حلوہ بنایا ہے اماں، آپ کو پسند ہے نا!

ہاجرہ نے دبے دبے جوش و خوشی سے جواب دیا۔

ہاں...... خاتون بی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

مصطفیٰ منزل میں مانو خوشیوں کا پہرہ تھا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھے سبھی افراد خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے تھے۔ درمیانی میز پر انواع و اقسام کے کھانے سجے تھے۔ سکینہ کو آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اس کے ساتھ اس کے سبھی سسرالی آئے تھے جس میں اس کا شوہر، ساس اور دو عدد نندیں بھی شامل تھی، صرف اس کا بیٹا انور نہیں آیا تھا۔

خاتون بی نے دریافت کیا......

بیٹے...... انور کو بھی ساتھ لیں آتی؟

جی اماں وہ آنا چاہتا تھا لیکن دکان پر کچھ کام نکل آیا تو اس میں مصروف ہو گیا، اسی لیے نہیں آ سکا۔

سکینہ نے منہ میں چمچ رکھتے ہوئے وجہ بیان کی۔

ہائے میرا بچہ! بہت محنتی ہے...... اللہ اسے کامیابی عطا کرے۔

خاتون بی نے اسے دعا دی۔

آمین...... ویسے کھانا بڑے مزے کا بنا ہے۔ سکینہ نے داد دی۔

ہمم......! بہت اچھا ہے۔ سکینہ کی ساس اور نند نے بھی ہامی بھری۔

طاہرہ اور ہاجرہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور چہرے خوشی سے تمتما اٹھے، گویا کچن میں لگائے گئے تین چار گھنٹوں کا صلہ مل گیا ہو۔

ارے...... میری گڑیا کہاں ہے؟ کہیں نظر نہیں آ رہی۔ سکینہ نے کھوجتی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

وہ اسکول گئی ہے آپا! تھوڑی دیر میں آتی ہوگی۔ ہاجرہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ آپ آ رہی ہیں اگر بتا دیتے تو وہ اسکول ہی نہ جاتی۔ تبھی تو یہ دونوں بھی نہیں گئے۔ طاہرہ نے ہنستے ہوئے اپنے دونوں بیٹوں (ساحل اور عمران) کی جانب اشارہ کیا جو کھانے میں مصروف تھے۔ سکینہ کے دیکھنے پر مسکرائے اور دوبارہ کھانے میں محو ہوگئے۔

آں...... آپا! وہ...... اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ ہمارے لیے بہت بڑی خوش خبری لا...... رہی ہیں؟

اسلم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

ہاں آپا! بتائے کیا خوشخبری ہے؟ جمیل بھی متجسس ہوا۔

سکینہ خاموش بیٹھیں مسکراتے ہوئے سب کے چہرے دیکھنے لگی، جن پر بڑے بڑے سوالیہ نشان نمایاں تھے۔ اس کی خاموشی وہاں موجود بھی افراد کے تجسس کو بڑھا رہی تھی۔

سکینہ نے مسکرا کر پہلے اپنے شوہر کو دیکھا پھر ساس کو اور کہا......

بتاؤں گی، بتاؤں گی، تھوڑا صبر کریں بھئی! گڑیا آ جائے پھر بتاؤں گی۔

ہاجرہ کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔ لیکن وہ تو چھوٹی بچی ہے اس کا............ یہاں کیا ذکر؟

ہاجرہ نے دل میں سوچا، البتہ کچھ کہا نہیں۔

دروازے پر دستک ہوئی......

لیجیے آ گئی ہماری گڑیا!

طاہرہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

پھوپھی جان......! گڑیا کے چہرے پر حیرت و مسرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی سکینہ کے پاس آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

پھوپھی جان آپ کب آئیں؟ اس نے سکینہ سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

پھوپھی جان نہیں...... پھوپھی ماں کہو! سکینہ نے اس کے سر کا بوسہ لیا، اور کب آئیں نہیں بلکہ یوں پوچھ کہ کیوں آئیں۔ سکینہ نے نرمی سے اس کے سوال میں ترمیم کی۔

پھوپھی ماں......! گڑیا کی آنکھیں چمک اٹھی۔

سکینہ اب گڑیا بھی آ گئی ہے اب تو بتا دو بیٹے کیا بات ہے؟ خاتون بی نے دریافت کیا۔

جی...... سکینہ نے ہاجرہ اور جمیل کو دیکھا اور کہا۔

میں گڑیا کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں۔

آں...... لیکن...... آپا! گڑیا تو پہلے ہی سے...... آپ کی...... بیٹی ہے، پھر......؟ ہاجرہ نے ناسمجھی سے ہنستے ہوئے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑا۔

ہچ! ہاجرہ...... میرا مطلب ہے میں اپنے انور کے لیے گڑیا کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں! انور اور گڑیا کا رشتہ طے کرنے۔ سکینہ نے خوشی سے خوشخبری سنائی۔

ہوئی نا بہت بڑی خوش خبری! سکینہ کی چھوٹی نند نے کہا۔

ارے واہ! یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ خاتون بی نے دونوں ہاتھوں سے گڑیا اور نادیدہ انور کی بلائیں اتاریں۔

وہاں موجود سبھی کے چہرے مارے خوشی کے چمک اٹھے تھے، سب کے چہروں پر حیرت بھری خوشی رقص کر رہی تھی۔ سوائے ہاجرہ اور جمیل صاحب کے۔

جمیل صاحب ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ہاجرہ پر تو گویا بجلی گری تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئی تھی۔ اس کی شکل سے صاف واضح تھا کہ اسے بہت بڑا ناقابل قبول جھٹکا لگا ہے۔

لیکن اس کی شکل دیکھ کون رہا تھا۔ سارے لوگ آپس میں مبارک باد دے اور لے رہے تھے، ایک دوسرے کو مٹھائیاں کھلا رہے تھے۔

گڑیا کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی تھی لیکن وہ سب کی خوشی میں خوش ہو رہی تھی۔ سکینہ نے اس کے گلے میں پھولوں کا بھرا ہار ڈالا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لیں۔

واہ آپا! کیا خوش خبری سنائی ہے۔ دل خوش ہو گیا۔

ہاں واقعی......!

طاہرہ اور اسلم نے ایک ساتھ کہا۔

نہیں۔ ہاجرہ کے حلق سے بمشکل آواز نکلیں۔ نہیں...... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس کی آواز بہت مدھم تھی کسی کو سنائی نہ دیں۔

کیا ہوا ہاجرہ؟ سکینہ کو تشویش ہوئی۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہیے لیکن...... تمھارے چہرے سے...... ایسا لگ نہیں رہا۔

سکینہ نے اپنا جملہ ٹھہر ٹھہر کر پورا کیا تھا۔

تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ سکینہ فکر مندی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

گڑیا اٹھو اپنے کمرے میں جاؤ...... ابھی! ہاجرہ نے ابھی پر زور دیا۔

کیوں امی......؟ گڑیا نے معصومیت سے کہا، مجھے یہاں آپ سب کے ساتھ بیٹھنا ہے۔ دیکھیں یہاں کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ سب کتنے خوش ہیں! گڑیا کے چہرہ پر خوشی کے بلبلیں رقص کر رہے تھے۔

میں نے کہا نا جاؤ! ہاجرہ نے قدرے سختی سے کہا۔

گڑیا سہم گئی، اس نے باری باری ہاجرہ اور جمیل صاحب کو معصومیت سے دیکھا۔ ہاجرہ بلا کسی تاثر کے کھڑی تھی البتہ جمیل صاحب نے نرمی سے اسے جانے کے لیے کہا۔

گڑیا! جاؤ بیٹے، اپنے کمرے میں جاؤ اور تم دونوں بھی۔ ساحل اور عمران کی طرف دیکھا۔

جی...... وہ تینوں بے دلی سے اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں سناٹا چھایا تھا۔ سب کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا جسے سکینہ نے بذریعہ زبان ادا کیا۔

کیا ہوا ہاجرہ؟ تم نے گڑیا کو کیوں بھیج دیا؟

ابھی تو رسم کرنا باقی ہے! سکینہ نے میز کی جانب اشارہ کیا جہاں رسم کا سامان، پھول، کپڑے اور زیورات وغیرہ رکھے تھے۔

آپا...... ہاجرہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن جمیل صاحب نے اسے سر کے اشارے سے چپ رہنے کے لیے کہا اور خود گویا ہوئے۔

آپا ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ انھوں نے تمہید باندھی۔ اماں کے بعد ہم نے سب سے زیادہ آپ کی باتوں کو اہمیت دی ہے لیکن...... وہ ٹھہر گئے۔

آپ جو فرمائش کرتیں ہم اسے پورا کرتے لیکن ہم آپ کو گڑیا کا رشتہ نہیں دے سکتے! ہاجرہ نے دوٹوک لہجے میں جمیل صاحب کی بات کو مکمل کیا۔

کیا! سکینہ کی آنکھیں بے یقینی سے پوری کھل گئیں اور سانس رک گیا۔ اس نے اسی کیفیت میں اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھا جو سر نیچے جھکائے خاموش کھڑا ہاجرہ کی باتوں کی صداقت ظاہر کر رہا تھا۔

وہاں موجود سبھی افراد ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ہاجرہ......! خاتون بی نے ہاجرہ کو روکنے کی کوشش کی۔ کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو!

جمیل! سکینہ کو اپنی ہی آواز کہیں بہت دور سے آتی سنائی دیں۔ تم مجھے انکار کر رہے ہو۔

آپا میں آپ کو کبھی بھی انکار نہیں کر سکتا لیکن...... جمیل صاحب نے ندامت سے سکینہ کو دیکھا۔

لیکن کیا......! کیا خرابی ہے میرے انور میں؟ سکینہ کی بے یقینی اب غصے میں بدل رہی تھی۔

بولو جمیل......! سکینہ نے اسے جھنجھوڑا۔

نہیں آپا آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ جمیل صاحب سکینہ کو سمجھانے کی سعی کرنے لگی۔ انور تو بہت اچھا بچہ ہے اور ہمارے انکار کی وجہ انور یا کوئی اور نہیں ہے بلکہ گڑیا کی عمر ہے۔

ہاں آپا سمجھنے کی کوشش کریں وہ ابھی اتنی چھوٹی ہے کہ اسے ان باتوں کی سمجھ تک نہیں ہے۔ ہاجرہ بھی وضاحت کرنے لگی تھی۔ گڑیا ابھی بہت چھوٹی ہے۔

کیا! گڑیا بہت چھوٹی ہے، سکینہ نے استہزائیہ کا جملہ دہرایا۔ تم بھول رہی ہو ہاجرہ کہ میری...... اور خود تمھاری بھی شادی تقریباً اسی عمر میں ہوئی تھی۔

آپا اس وقت کی بات کچھ اور تھی...... لیکن اب زمانہ بدل رہا ہے۔

سکینہ ہاجرہ کی بات کو نظر انداز کر کے جمیل سے مخاطب ہوئی۔

اور جمیل ہم نے کون سا کل ہی بارات لے کر آنی ہے۔ ابھی صرف چھوٹی سی منگنی کریں گے اور سال دو سال بعد شادی اور رخصتی۔ وہ التجائی نظروں سے جمیل کو دیکھ رہی تھی۔

بس کرو سکینہ۔ کیا تم ہمیں اس لیے یہاں لائی تھیں؟ سکینہ کی ساس نے اسے ٹوکا۔ بس بہت ہوا، اب ہم یہاں اور ایک سیکنڈ بھی نہیں ٹھہریں گے۔ وہ جانے لگی تو خاتون بی نے انھیں روکا......

رک جائیے بہن جی! ایسے ناراض ہو کر نہ جائیے۔ میں اسے (ہاجرہ کی طرف اشارہ کیا) سمجھاؤں گی۔

بس! انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں کھڑا کیا، ہمیں اور کچھ نہیں سننا! بہت بے عزتی کروا چکے ہم اپنی۔ سکینہ کی طرف دیکھ کر کہا، ہم جا رہے ہیں، جب تمھارا دل بھر جائے تو واپس آ جانا۔

اس سے پہلے کے کوئی کچھ کہتا وہ وہاں سے جا چکیں تھی۔

سکینہ کے شوہر نے حقارت سے کہا......

دیکھ لیا......! بہت ناز تھا نا تمھیں اپنے مائیکے والوں پر، انھ! وہ کہہ کر وہاں رکا نہیں۔

سکینہ سکتے کی کیفیت میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اسے سب کچھ ختم ہوتا محسوس ہوا۔ وہ جانتی تھی اب ساری زندگی اسے انہی باتوں اور طعنوں سمیت گزارنی پڑے گی۔ اس نے ایک آخری کوشش کرنے کی کوشش کی۔

میں کتنے مان کے ساتھ رشتہ لینے آئی تھی...... لیکن آپ لوگوں نے (دکھ و مایوسی کے ساتھ جمیل کو دیکھا)...... میرا ذرہ برابر بھی مان نہ رکھا۔

سکینہ کی آواز میں بے بسی ہی بے بسی تھی۔ جمیل اگر یہ رشتہ نہیں ہوا اور تمھیں یہی منظور ہے تو ٹھیک...... اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

اگر نیا رشتہ نہیں بن سکتا تو پھر پرانے رشتے کی بھی کیا ضرورت ہے......؟ بے بسی غصے کی صورت اختیار کرنے لگی تھی۔ آج سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

سکینہ......! خاتون بی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں تم سے اپنا رشتہ توڑتی ہوں......

آپا! جمیل نے بے اختیار کہا، ایسے نہ کہیے آپا...... ایسا نہ کریں۔

مر گئے میرے لیے آپ سب اور آپ سب کے لیے میں۔

وہ غصے سے پھنکارتی ہوئی لمبے لمبے قدم اٹھاتی منظر سے غائب ہو چکی تھیں۔ وہاں موجود سبھی افراد کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

اسلم اور طاہرہ خاموش کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے، وہ کہتے تو کیا کہتے ایک طرف بھائی تھا تو دوسری جانب بہن۔

سکینہ نے انکار کا کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا۔ وہ انکار برداشت نہ کر سکی تھی اور طیش میں آ کر اپنے سارے رشتے ناطے قطع کر گئیں تھی۔

سکینہ......! خاتون بی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ وہ صدمہ کی کیفیت میں کھڑی تھیں سب کچھ بہت جلدی جلدی ہوا تھا۔

ہاجرہ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے! خاتون بی اپنے نڈھال ہوتے جسم اور آواز کو بمشکل سنبھالتے ہوئے سارا قصور ہاجرہ پر ڈالنے لگی۔

وہ تمھاری وجہ سے گئی ہے...... اس نے...... اس ہم سے سارے رشتے توڑ دیے...... صرف تمھاری وجہ سے...... ان کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔

جمیل تم ابھی بھی اسے روک سکتے ہو بیٹے! خاتون بی نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی، اس کی بات مان لو، وہ گڑیا کو اپنی بیٹی کی طرح رکھیں گی! سکینہ کو واپس لے آؤ بیٹے۔ انھوں نے التجا بھری نظروں سے جمیل صاحب کو دیکھا۔

جمیل صاحب خاموش کھڑے تھے، ان کی ماں جیسی بڑی بہن ایک نیا رشتہ نہ بننے کی بنا پر پرانے تمام رشتے توڑ گئی تھیں۔ وہ کیا کہتے۔

جمیل کی خاموشی انھیں تپا رہی تھیں۔

تم دونوں (ہاجرہ اور جمیل صاحب کو غصے سے دیکھا) میری ایک بات اچھے سے سمجھ لو، آواز میں تیزی تھی اگر سکینہ نے ہم سے دوبارہ رشتہ نہ جوڑا...... تو ہمارا ابھی تم سے کوئی تعلق نہ رہے گا!

اماں جمیل نے تڑپ کر اپنی ماں کو دیکھا۔

غصے و بے بسی سے ان کا سانس پھول رہا تھا اس سے پہلے کے کوئی کچھ کہتا وہ پھولتی سانسوں کے ساتھ صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

کیا رشتے اتنے کمزور ہوتے ہیں امی......! درخشاں کی آواز نے ماحول پر چھائے سکوت کو توڑا۔

نہیں...... رشتے پہلے کم ظرف ہوتے ہیں رشتوں کی کم ظرفی انھیں کمزور کر دیتی ہے اور کمزور رشتے کبھی بھی ٹوٹ سکتے ہیں۔

ہاجرہ کے لہجے میں ملال تھا۔

کبھی...... دوبارہ رشتہ جوڑنے کی کوشش نہیں کی آپ نے......؟

کی تھی...... کئی دفعہ کوشش کی تھی۔ غلطی نہ ہونے پر بھی کئی دفعہ معافی مانگ چکے ہیں۔ میں تھک گئی، لیکن تمھارے ابو، جمیل صاحب تو...... آج بھی معافی مانگ رہے ہیں اور سکینہ آپا...... ہاجرہ نے افسوس سے ایک گہری سانس لی، وہ تو ہماری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔

یہاں تک کہ تمھاری دادی جان کے انتقال پر تمھارے ابو کو ان کا آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

درخشاں خاموش بیٹھی بنا پلک جھپکائے سب سن رہی تھی لیکن اس کے اندر سوالات کا ایک ہجوم تھا جو باہر آنا چاہتا تھا، وہ پھر بھی چپ رہی۔

کیونکہ...... ہاجرہ اس کے سوال کا انتظار کیے بغیر ہی جواب دینے لگی، تمھاری دادی کی وصیت تھی کہ اگر سکینہ آپا ان کے جنازے پر نہیں آئیں تو جمیل صاحب بھی نہ آئے۔

اور سکینہ آپا نے یہ شرط رکھ دی کہ اگر جمیل صاحب یا ہم سے کوئی بھی وہاں موجود ہوا تو وہ شریک نہیں ہوں گی۔

اتنا سب ہو گیا...... اور اب تک مجھ کسی نے کچھ بتایا کیوں نہیں تھا؟ درخشاں نے بالآخر وہ سوال پوچھا جو کب سے اس کے اندر مچل رہا تھا اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

جمیل صاحب نے منع کیا تھا کہ جب تک تمھیں ان باتوں کا شعور نہیں آ جاتا تمھیں کوئی کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ ہاجرہ نے مزید کہا۔

اور ہم نہیں چاہتے تھے کہ بچپن ہی سے تم اپنی پھوپھی ماں سے نفرت کرنے لگ جاؤ...... ویسے بھی جمیل صاحب کا کہنا ہے کہ بھلے ہی آپ

نے ہم سے رشتہ قطع کر دیا ہو لیکن ہم نے نہیں کیا، اور نہ کبھی کریں گے! ہاجرہ نے ایک ٹھنڈی گہری سانس اندر تک اتاری گویا ماضی کی تمام تر تکلیف دہ یادوں کو دوبارہ اپنے باطن میں دفن کر رہی ہوں۔

ہاجرہ! تم یہاں ہو؟ اور میں تمھیں سارے ہال میں تلاش کر رہی ہوں...... ہاجرہ کو کسی بوڑھی خاتون نے پکارا۔

یہاں آؤ جلدی......!

جی...... ہاجرہ نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا، درخشاں پر ایک ہمدردی بھری نظر ڈالی اور چہرے پر زبردستی کی بشاشت طاری کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

درخشاں خاموش و اداس نظروں سے ہال میں موجود لوگوں کی ہشاش بشاش چہرے تک رہی تھی، اسے دور ایک شفیق و نرم مسکراہٹ چہرا دکھائی دیا جو اسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔

گڑیا......! جمیل صاحب نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

چلیے بیٹے! دیر ہو رہی ہے۔ وہ ہاجرہ اور اسے واپس گھر لے جانے آئے تھے۔

ابو...... درخشاں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

انسان کتنا کم ظرف ہے نا...... نیا رشتہ بنانے جاتا ہے اگر نیا رشتہ نہ بنے تو پرانا بھی توڑ آتا ہے......

جمیل صاحب کے چہرے پر تکلیف ابھری، انھوں نے بے چارگی و بے بسی سے اپنی گڑیا کو دیکھا۔

جمیل صاحب جان چکے تھے کہ درخشاں بھی سب جان چکی ہے۔

❒❒❒

Kausar Syed Yousuf
Bharat Nagar Pathari Road
Parbhani-431401 (MS)
Mob. 9022092576

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC:CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

افسانہ

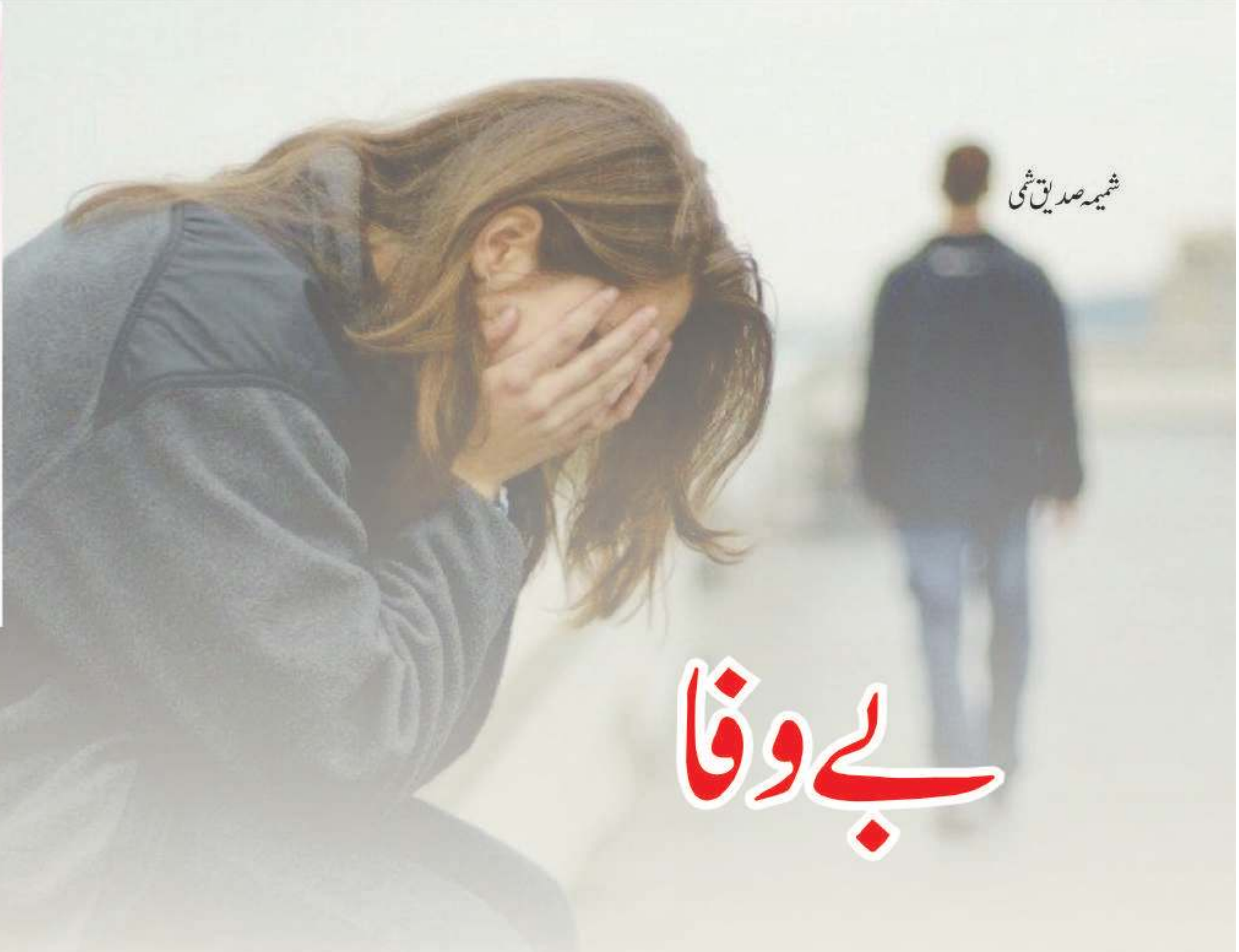

شمیمہ صدیق شمی

بے وفا

گھر میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے اپنا حلیہ ٹھیک کر لیا تھا ،ظاہری طور پر تو اُسے کوئی زخم نہیں آیا تھا مگر اس کے دل کے اتنے ٹکڑے ہوئے تھے کہ کرچیاں سنبھالے نہیں سنبھل رہیں تھیں ۔اپنی بھیگی آنکھیں صاف کر،لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے وہ گھر میں داخل ہوئی

" بیٹا آ گئی تم واپس" ؟

" جی دادی" مختصر سا جواب دے کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ،کچھ گھنٹے کمرے میں بند رہ کر بے تحاشہ آنسو بہاتی رہی پھر جب دادی نے بلایا تو مصنوعی مسکراہٹ سجائے کمرے سے باہر نکل آئی مگر آنکھیں رونے کی صاف چغلی کھا رہیں تھیں ۔

" یہ تمھاری آنکھوں کو کیا ہوا ،کیا تم رو رہی تھی ؟ " دادی پریشانی سے بولی

" نن نہیں تو دادی " وہ اپنے آنسوؤں کو اندر دھکیلتے ہوئے بولی ،آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگنے کی کوشش کر رہے تھے اور گلا رندھ سا گیا تھا۔

" اچھا !اب تم اپنی دادی سے باتیں بھی چھپانے لگی ہو، کیوں ؟ میں جانتی ہوں تم واپس آ کر کمرے میں پڑے پڑے بہت دیر تک روتی رہی ہو" دادی نے اُس کے قریب آ کر اُس کے گالوں پر لڑھکتے نمکین قطرے اپنی پوروں پر چُنے اور اس کی بھیگی پلکیں چوم لیں ،وہ دادی سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی ۔دادی نے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ اصل حقیقت چُھپا کر صرف اتنا بولی" کچھ نہیں دادی بس امی یاد آ گئی تھی تو رونا آ گیا"

رابعہ بہت ہی خوبصورت ،سلیقہ منداور ذہین لڑکی تھی ،بچپن میں ہی ماں کے سائے سے محروم ہو گئی تھی ،باپ اور دادی نے بھر پور محبت اور توجہ سے پرورش کی تھی ،باپ کی بھرپور توجہ نے شخصیت میں خوب اعتماد پیدا کیا تھا۔کالج میں بھی وہ اپنی ذہانت کی وجہ سے جلد ہی لڑکیوں میں مقبول ہو گئی تھی ،اپنے نرم لہجے سے اُس نے سب کے دل جیت لیے تھے ،اس کی جماعت میں ارشد نامی ایک لڑکا بھی بڑا ذہین تھا وہ اکثر مختلف موضوعات پر رابعہ سے بحث ومباحثہ کرتا رہتا تھا، کچھ دِنوں سے اِن دونوں کی باتیں کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئیں تھیں جو کہ جماعت کے باقی لڑکے لڑکیوں نے بھی محسوس کی تھیں ۔اب لڑکیاں انھیں دیکھ دیکھ کر سرگوشیاں کرتیں ،یہ دونوں اب اکثر ساتھ ساتھ نظر آتے ۔باتوں ہی باتوں میں ان کی دوستی ہو گئی اور پتہ بھی نہ چلا کہ دوستی کب پیار میں بدل گئی اور وہ دونوں ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھانے لگے۔کالج کی پڑھائی ختم کر کے کچھ اِن کے ساتھی

گھر بیٹھ گئے اور چند نے آگے بھی اپنی پڑھائی جاری رکھی۔رابعہ مزید آگے نہ پڑھ سکی کیونکہ دادی اب بہت بوڑھی ہو چکی تھی اور اب گھر سنبھالنے میں دادی کو مشکل ہو رہی تھی اس لیے وہ گھر میں رہنے لگی تا کہ دادی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔وہ ارشد سے رابطے میں تھی اور وقت گزرنے لگا ، پہلے جو طویل باتیں ہوا کرتی تھیں اب مختصر ہو کر رہ گئیں تھیں۔

"اچھا! اب تم کب بھیج رہے ہو اپنے والدین کو ہمارے یہاں؟

"پچھلے ایک سال سے وہ برابر یہی ایک سوال کر رہی تھی۔

"کہا نا جیسے ہی کوئی مناسب موقعہ ملے گا گھر والوں سے بات کروں گا" اُس کے لہجے میں کچھ تلخی سی آ گئی تھی۔پچھلے چند دنوں سے رابعہ نے محسوس کیا کہ وہ اب پہلے جیسا ارشد نہیں رہا بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا اور سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا تھا۔اب وہ بہت کم بات کرتا اور اگر کبھی رابعہ فون کر لیتی تو ایک دو باتیں غصے سے کر کے فون رکھ دیتا۔ایک دن وہ بازار سے کچھ ضروریات کی چیزیں خریدنے گئی تو اسے کالج کی ایک سہیلی مل گئی وہ دونوں کالج کی یادوں کو تازہ کرنے لگیں ، باتوں ہی باتوں میں ارشد کا ذکر بھی آ گیا اور اس کی سہیلی نے بُرا سا منہ بنایا ارشد کے نام پر۔

"اک بات کہوں رابعہ برا تو نہیں مانو گی نا؟"

"نہیں تو" وہ خوش اخلاقی سے بولی۔

"دیکھو یہ جو ارشد ہے نا اس پر اعتبار مت کرنا ، مجھے کچھ یہ لڑکا ٹھیک نہیں لگتا"

دوسرے دن وہ گھر سے نکل کر پارک میں پہنچ گئی اور انتظار کرنے لگی ،وہ آتے جاتے لوگوں کو گھور رہی تھی بہت سارے لوگ ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے ،اس کی نظر ہر آتے جاتے شخص پر پڑ رہی تھی لیکن جس کے انتظار میں وہ گھنٹوں بیٹھی خوار ہوئی وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔اس کی آنکھوں میں تیرگی سی جھلک رہی تھی۔بار بار فون کرنے پر بھی ارشد سے کوئی رابطہ نہ ہوسکا ،اچانک اس کے موبائل کی اسکرین جگمگائی تو اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی طرح کِھل اُٹھا مگر اگلے ہی لمحے آنسوؤں کی قطار نے رخساروں پر ڈیرا جمالیا،پیام (میسیج) میں یہ لکھا تھا

رابعہ اپنے من میں آئے ہوئے سوالات سہیلی سے پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ اُسے کوئی فون کال آ گئی اور وہ معذرت کرتے ہوئے چلی گئی۔اس نے بے دلی سے چند چیزیں خریدیں اور گھر واپس آ گئی ، اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی ارشد کو فون کیا مگر بار بار فون کرنے پر بھی اس نے کال ریسیو نہیں کی اور پیام (میسیج) میں لکھا کہ مصروف ہوں کل بات کروں گا۔اس کے من میں ارشد کو لے کر اب شک سا ہونے لگا ، جب شک زیادہ بڑھنے لگا تو وہ اُسے بار بار فون کرنے لگی اور آخر کار اس نے کال لے لی اور غصے سے بولا" کیوں مجھے بار بار تنگ کرتی ہو؟ میرے پاس تیری فضول باتیں سننے کے لیے وقت نہیں ہے، اور یہ بار بار فون کرنا بند کر دو، کل پارک میں آ جانا وہیں بات کرتے ہیں" اور فون کٹ کر دیا۔

دوسرے دن وہ گھر سے نکل کر پارک میں پہنچ گئی اور انتظار کرنے لگی ، وہ آتے جاتے لوگوں کو گھور رہی تھی بہت سارے لوگ ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے، اس کی نظر ہر آتے جاتے شخص پر پڑ رہی تھی لیکن جس کے انتظار میں وہ گھنٹوں بیٹھی خوار ہوئی وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔اس کی آنکھوں میں تیرگی سی جھلک رہی تھی۔بار بار فون کرنے پر بھی ارشد سے کوئی رابطہ نہ ہو سکا ، اچانک اس کے موبائل کی اسکرین جگمگائی تو اسکرین پر نگاہ ڈالتے ہی اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اُٹھا مگر اگلے ہی لمحے آنسوؤں کی قطار نے رخساروں پر ڈیرا جما لیا، پیام (میسیج) میں یہ لکھا تھا

"آج کے بعد کبھی بھول کر بھی مجھے فون یا میسیج نہ کرنا، میں تم جیسی بدکردار لڑکیوں کو خوب جانتا ہوں ، شادی کرنا تو دور میں تم سے شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا اور ہاں سنو مجھے کوئی اور مل گیا ہے اور اب میں کسی اور کا ہم سفر بننے جا رہا ہوں"

"ارشد تم یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ ہم دونوں نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائیں تھیں اور تم کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کر رہے ہو اور مجھے بدکردار کہہ رہے ہو؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟" اس نے روتی آنکھوں اور کپکپاتے ہاتھوں سے میسیج ٹائپ کیا۔آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

"دیکھو رابعہ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔بس آج کے بعد رابطہ ختم ، کبھی بھول کر میسیج یا فون نہ کرنا، بھلا تم جیسی لڑکیاں بھی دل کے تخت پر بٹھانے کے قابل ہیں؟ زندگی میں شامل کرنے کے قابل ہیں؟ جو لفظوں کے سحر میں ڈوب کر غیروں سے رابطہ رکھتیں ہیں؟ اور تم جیسی لڑکیوں کا کیا بھروسہ کل کوئی اور میٹھے بول بولے گا تو تم مجھے اس کی خاطر دھوکہ دو گی تم جیسی لڑکیوں کا بھلا کیا اعتبار۔" کس قدر ظالم ، سنگدل ، بے وفا اور بدلحاظ تھا وہ

شخص ۔ارشد نے جس انداز میں اس کی توہین کی تھی اس پر اس کا پورا وجود ماتم کناں تھا۔

"سچ کہتی تھی دادی کہ بیٹا یہ دنیا جتنی سیدھی نظر آتی ہے نا اتنی ہے نہیں ،بیٹیوں کو کبھی بھی کسی کے لفظوں کے سحر میں نہیں آنا چاہیے" وہ سوچ رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آنسو بھی صاف کر رہی تھی۔

"اس ظالم اور بے وفا شخص نے اپنے لہجے سے رویے سے اور اپنی باتوں سے اس کے کردار اور ذات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں تھیں ۔اسے دادی کی نصیحتیں بار بار یاد آرہی تھیں جو دادی اسے گھر سے کالج نکلتے وقت کیا کرتی تھی اور وہ ماتھے پر شکن لاتے ہوئے سنا کرتی تھی ۔اندھا اعتبار جب ایک بااعتماد انسان کو شکست سے دوچار کرتا ہے تو وہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور وہ بھی بکھر کر رہ گئی تھی ۔اسے معلوم ہوگیا تھا کہ لفظوں کے سحر میں ڈوب کر انسان کس قدر اذیت سے دوچار ہوتا ہے اور کس قدر کرب کی جاگیریں پھر زیست کا مقدر بن جاتیں ہیں۔"

اس ظالم اور بے وفا شخص نے اپنے لہجے سے رویے سے اور اپنی باتوں سے اس کے کردار اور ذات کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں تھیں ۔اسے دادی کی نصیحتیں بار بار یاد آرہی تھیں جو دادی اسے گھر سے کالج نکلتے وقت کیا کرتی تھی اور وہ ماتھے پر شکن لاتے ہوئے سنا کرتی تھی ۔اندھا اعتبار جب ایک بااعتماد انسان کو شکست سے دوچار کرتا ہے تو وہ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور وہ بھی بکھر کر رہ گئی تھی ۔اسے معلوم ہوگیا تھا کہ لفظوں کے سحر میں ڈوب کر انسان کس قدر اذیت سے دوچار ہوتا ہے اور کس قدر کرب کی جاگیریں پھر زیست کا مقدر بن جاتیں ہیں۔

رابعہ کو اُس کی بے وفائی سے زیادہ دُکھ اس کے زہریلے الفاظ کا تھا جنھوں نے نہ صرف اس کی کردار کشی کی تھی بلکہ اس کے دل اور روح دونوں کو گھائل کر کے رکھ دیا تھا۔اسے اپنی ایک سہیلی کی باتیں یاد آرہی تھیں ،جو اکثر کہا کرتی تھی" یہ پیار وار کچھ نہیں ہوتا ،سب وقتی باتیں ہیں ،سب ڈھونگ ہے ،محبت کس پاکیزہ جزبے کا نام ہے بھلا دل پھینک لوگ کیا جانیں ،پاگل ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو کسی کی تھوڑی سی دل لگی کو بھی محبت سمجھنے لگتیں ہیں،، وہ اپنی ہی دھن میں کہتی جاتی ۔رابعہ اور باقی سہیلیاں اس کی باتوں کا مذاق اڑاتیں اور کسی حد تک غصہ بھی ہوجاتیں ۔رابعہ کو آج رہ رہ کر اس کی باتیں یاد آرہی تھیں اور آنسو اس کے رخسار بار بار بھگو رہے تھے۔

" جانتی ہو رابعہ اس دنیا میں اور آجکل کے وقت میں زیادہ تر تعداد ،بے وفا ،بے غیرت ،بے مروت اور کم ظرف لوگوں کی ہے اور جانتی ہو رابعہ کم ظرف ،بے وفا ،بے مروت اور یہ بے حس لوگ کبھی کسی سے وفا نہیں کرتے ہیں ،وہ اپنے وقتی جزبے کا اظہار کر کے دوسروں کے جزبات و احساسات کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں اور جب جی بھر جاتا ہے تو دوسروں کے کردار پروار کر کے بے مول کر دیتے ہیں، گہرا زخم دے کر خاموشی کا تحفہ دے جاتے ہیں اور اندھا اعتبار کرنے والوں کے حصے پچھتاوے آتے ہیں ،جو زہریلے ناگ کی طرح ڈستے رہتے ہیں،،

دادی کتنے دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ وہ بہت گُم صم رہنے لگی ہے۔بات کا جواب ہوں ہاں میں دیتی ہے اور لہجہ بھیگا بھیگا سا ہے۔اگرچہ اس نے دادی سے ساری حقیقت چھپالی تھی مگر دادی زمانہ شناس عورت تھی اور وہ کیسے نہ اس کی حالت دیکھ کر اس کے غم کو جان پاتی اور اس کی حالت سے بے خبر رہتی ،اس نے ماں اور دادی دونوں کا پیار دیا تھا اسے

وہ اس کے اندر کا سارا حال پڑھ چکی تھی ،اس لیے پیار سے سمجھانے لگی" دیکھ بیٹا انسانی زندگی میں بہت کچھ برا بھی ہوجاتا ہے ،انسان تکلیف سے دوچار بھی ہوتا ہے مگر میری بیٹی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم ایک ہی دُکھ کو دل سے لگا کر آنسو بہاتے رہیں اور اپنی دنیا اور آخرت برباد کرتے رہیں ،دیکھ بیٹا میں جانتی ہوں ،اپنی بکھری ذات کو سمیٹنا بہت مشکل ہے تیرے لیے مگر ناممکن نہیں ،سب کچھ بھول جا میری بیٹی اور اپنی زندگی سے متعلق آنے والے وقت کے بارے میں سوچ ،، دادی نے اُس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی دادی" ،اُس نے دادی کو گلے لگاتے ہوئے کہا اس نے اب نہ صرف دادی کی باتیں سُنی تھیں بلکہ دل میں اُتار بھی لیں تھیں ،اسے دادی پر بہت پیار آرہا تھا کہ کس قدر بنا کہے سب سمجھ جاتی ہیں اور اپنی باتوں سے زخموں پر مرہم رکھتی ہیں ۔اس نے بھی اب دادی کی باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ساری باتیں بُھلانے کا ارادہ کرلیا تھا اور دل ہی دل میں ایک نیا فیصلہ کرلیا۔

□□□

Shameema Siddiqui Shami
Chak Saidpura
Shopian-192303 (J & K)

ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی

حمی نفاسیہ

Puerperal Fever

حمی نفاسیہ یا پرسوت کا بخار کے بارے میں جاننے سے پہلے نفاس یعنی Puerperium کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔وضع حمل کے بعد 6 ہفتہ یا42 دن کی مدت کوسن نفاس کہتے ہیں۔اس دوران عانہ یعنی Pelvis کے اعضا کم و بیش حمل سے پہلے کی حالت میں واپس آجاتے ہیں۔اس دوران خواتین کی قوت مناعت(Immunity) کم ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے خواتین کوتعدیہ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔اس لیے اس دوران خواتین کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔نفاس دوقسم کا ہوتا ہے۔پہلی قسم کو طبعی نفاس(Normal Puerperium) کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم کو غیر طبعی نفاس(Abnormal Puerperium) کہتے ہیں۔حمی نفاسیہ غیر طبعی نفاس کی ایک صورت ہے۔اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

حمی نفاسیہ کی تعریف:

وضع حمل(Delivery) کے بعد شروع کے ۱۰ دن میں ہونے والے بخار کوحمی نفاسیہ کہتے ہیں۔جبکہ وضع حمل کے پہلے 24 گھنٹہ کے اندر جو بخار آتا ہے اس کوحمی نفاسیہ میں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔حمی نفاسیہ عام طور پر مجرائے تناسل(Genital tract) کے تعدیہ(Infection) کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔

اسباب

حمی نفاسیہ کا سب سے عام سبب ورم بطانہ رحم (Endometritis) ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں تعفن نفاسیہ (Puerperal sepsis) ہوسکتا ہے۔حمی نفاسیہ کے دوسرے اسباب میں ورم ثدی(Mastitis)،تعدیہ مجرائے تنفس(Respiratory tract infection)،ورم حوض الکلیہ (Pyelonephritis)التہاب ورید (Thrombophelebitis) شامل ہیں۔اس کے علاوہ آنول (Umblical cord) کا پوری طور سے خارج نہ ہونے کی وجہ سے بھی حمی نفاسیہ ہوسکتا ہے۔

ورم بطانہ رحم(Endometritis) کا سب سے عام عام سبب وضع حمل میں تاخیر کا ہونا ہے جس کو طبی اصطلاح میں Prolonged Labor کہتے ہیں۔اس کے علاوہ وضع حمل کے دوران حاملہ کا بار بار امتحان کرنا اور فقر الدم(Anemia) بھی اس کے اسباب میں شامل ہیں۔

حمی نفاسیہ میں تعدیہ کا سب سے عام جرثومہ Group A Beta Hemolytic Streptococci ہے اس کے علاوہ Enterococus, E. Coli, Klepsila, Proteus جیسے جراثیم بھی حمی نفاسیہ کا سبب ہوتے ہیں۔مشاہدہ میں آیا ہے کہ اگر بچہ کی ولادت آپریشن سے ہوتی ہے تو اس صورت میں حمی نفاسیہ کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے جبکہ اگر ولادت طبعی طور سے یعنی Normal delivery سے ہوتی ہے تو حمی نفاسیہ کے ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔

علامات

حمی نفاسیہ میں خواتین کو بخار 101 سے 105 ڈگری فارن ہائٹ تک ہوسکتا ہے، پیٹ کے نچلے حصہ میں درد، تکان، کمزوری ہوتی ہے۔اور مہبل سے بدبودار رطوبت کا اخراج ہوتا ہے جس کو Foul smelling vaginal discharge کہتے ہیں۔مہبل اور عنق الرحم میں زخم بھی پائے جاسکتے ہیں۔چونکہ شکم کے عضلات(Abdominal Muscles) میں

تناؤ رہتا ہے اس لیے مریضہ اپنے پیر سمیٹے رہتی ہے۔ مریضہ کا امتحان کرنے پر پیٹ کے نچلے حصہ میں دبانے سے درد بڑھ جاتا ہے۔

تفتیشات (Investigations)

خون کی جانچ کرانے پر خون میں کریات بیضاء یعنی Total leucocytes طبعی مقدار سے زیادہ ہوتی ہیں،اس کے علاوہ Erythrocyte Sedimentation rate اور C Reactive Protein بھی طبعی مقدار سے زیادہ ہوتے ہیں۔ Procalcitonin بھی بڑھ سکتا ہے جس کی وجہ سے شدید قسم کا حمی نفاسیہ ہوجاتا ہے جس کو Sepsis Syndrome کہتے ہیں۔

تحفظ

وضع حمل سے پہلے

☆ حاملہ کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ حاملہ میں خون کی کمی نہ ہونے دی جائے۔

☆ غیر ضروری مہبل کے معائنہ سے پرہیز کرایا جائے۔

☆ مباشرت سے پرہیز کرنے کی ہدایت کی جائے۔

وضع حمل کے دوران۔

☆ وضع حمل کے دوران تمام دافع عفونت تدابیر کا خاص خیال رکھا جائے۔

☆ بار بار مہبل کا معائنہ نہ کیا جائے۔ اگر ضروری ہو تبھی مہبل کا معائنہ کیا جائے۔۔

وضع حمل کے بعد

☆ حمی نفاسیہ میں مبتلا تمام عورتوں کو علیحدہ کمرہ میں رہنے کی ہدایت دی جائے۔

☆ مریضہ کے کمرے میں زیادہ لوگوں کو نہ آنے کی ہدایت دی جائے۔

عام علاج

☆ مریضہ کو مکمل آرام کرنے کی ہدایت دی جائے۔

☆ غذا ہلکی اور جلد ہضم ہونے والی دی جائے مثلاً روٹی، دودھ، اور پھلوں کا رس وغیرہ

☆ اگر خون کی کمی ہو تو فولاد کے مرکبات دئے جائے۔ اگر شدید خون کی کمی ہو تو مریضہ کو خون چڑھایا جائے۔

☆ بخار کی صورت میں دافع حمی دوائے دی جائیں۔

☆ بچہ کو ماں سے الگ رکھنے کی ہدایت دی جائے۔

☆ قبض کی صورت میں دافع قبض ادویہ مثلاً قرص ملین کا استعمال کیا جائے۔

خصوصی علاج

☆ جراثیم کش (Antibiotics) دوائیں استعمال کرائی جائیں مثلاً Clindamycin, Gentamycin اور Metronidazole دوائیں استعمال کرائی جائیں۔ جراثیم کش ادویہ کا استعمال سات سے دس دن تک کیا جائے۔

یونانی علاج

☆ تخم کاسنی 3 گرام، بیخ کاسنی 4 گرام، مکوخشک ۴ گرام، برگ شاہترہ 4 گرام، چرائتہ تلخ 4 گرام پانی میں جوش دے کر مل چھان کر شربت بزوری ۲۵ ملی لیٹر کے ساتھ پلائیں۔

☆ حب قرطم 7 گرام، بادیان 7 گرام، گاؤزباں 5 گرام، پوست ہلیلہ زرد 7 گرام تخم خربوزہ ۷ گرام، پرسیاؤشاں ۷ گرام، ساری دواؤں کو ابال چھان کر شربت بزوری 25 ملی لیٹر کے ساتھ پلائیں۔ ساتھ ساتھ دافع تعفن محلول سے برابر ڈوش کرتے رہیں۔

ان دواؤں سے جب نفاس نکل کر آنے لگے تو مقوی دوائیں استعمال کرائیں۔ مثلاً خمیرہ گاؤزباں سادہ ۵ گرام، خمیرہ مروارید ۵ گرام کا استعمال کرائیں۔

حوالہ جات (References)

1۔ ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف آبسٹیٹرکس، 8واں ایڈیشن، جے پی بردرس، نئی دہلی، 2015، صفحہ 500-504

2۔ ڈاکٹر سید محمد عباس رضوی، قبالیات، تیسرا ایڈیشن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2002، صفحہ 303-306

3۔ علم القابلہ، حکیم سید محمد حسان نگرامی، اودھ پرنٹنگ پریس، لکھنؤ، 1991، صفحہ 171-175

4۔ مولانا حکیم عزیز الرحمان اعظمی، وصی میڈیکل ڈکشنری انگلش۔ اردو، مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، 2001، صفحہ 1166,400,301

5۔ ڈبلو ایچ او انٹرنیشنل اسٹنڈرڈ ٹرمینالوجیز آن یونانی میڈیسن، 2022، صفحہ 313

□□□

Dr. Mohd Safwan Kidwai

Village Turkani,

Post Safdarganj

District Barabanki-225412 (Uttar Pradesh)

Mobile: 9005109892

مراسلہ

'ماہنامہ خواتین دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔تمام مضامین قابل غور وفکر ہیں۔شفیقہ فرحت کے طنز ومزاح کی فکری جہات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ایک خاتون نے اپنی جدوجہد سے کامیابی کے کتنے مرحلے طے کیے۔شاعرات کے منتخب اشعار بہت ہی جاندار ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع کی تنقید نگاری بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ خوبصورت بلا سے سیتا ہرن میں کرداروں کی مماثلت، کلاسیکی اردو شاعری میں رقیب کا کردار، ان تمام کرداروں سے قارئین کو روبرو کرانا ایک کمال کی فن کاری ہے۔ ادب اور صحافت پر ایک طائرانہ نظر میں مضمون نگار نے چند شعر میں بہت ہی عمدہ خیال پیش کیا ہے:

صحافت از سفارش ہے
صحافت دادنوازش ہے
تمھیں پالا ہے نازوں سے
ملایا جاں بازوں سے
نیا دور آیا ہے جب سے
نکالا گیا ہوں اصناف ادب سے

'نسائی ادب اور صاحبہ شہریار' خواتین کے حوصلوں کو پختگی بخشتا ہے۔'ندا فاضلی کی شاعرانہ جہتیں'، 'ندا فاضلی کے منفرد کلام کی عکاسی'، عمدہ تحریر ہے۔حالی کی انفرادیت وعظمت ایسے موضوع قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔سیدہ نسرین نقاش، عائشہ صدیقہ جے، ہاجرہ خاتون نے اپنی حقیقی نظموں سے قاری کے ذہن پر نقش چھوڑنے کا کام کیا ہے۔ افسانہ کسک، مبارک ہو، خوش قسمت یہ تینوں حقیقت سے لبریز افسانے قاری کے دل ودماغ پر اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں اور قاری ایک پل کو اس میں یوں گم ہو جاتا ہے مانو کہ یہ کہانی اس کی ہی ہو۔ماحولیات وصحت کے تئیں بیدار رہنا بہت ضروری ہے۔صفائی نصف ایمان ہے اور ہم سب کو صفائی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔جان ہے جہان ہے۔میگزین کے آخری صفحے پر منفرد قلمکاروں کے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔

آخر میں خواتین دنیا کے لیے بہت ساری محبتیں اور نیک خواہشات

افسانہ، جونپور، اتر پردیش

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

انیس کے مرثیے (جلداوّل ودوم)

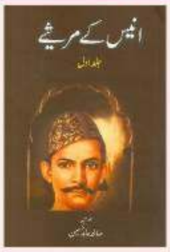

مرتبہ: صالحہ عابد حسین

تیسری اشاعت: 2022

صفحات: 504 (جلد 1)، 612 (جلد 2)

قیمت: 250 (جلد 1)، 275 (جل 2)

تاریخ طب (ابتدا تا عہد حاضر)

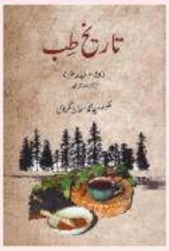

مصنف: حکیم سید محمد حسان نگرامی

ساتویں اشاعت: 2022

صفحات: 606

قیمت: 280 روپے

آب وہوا کا سائنسی مطالعہ

مصنف: طاہر حسین، میری طاہر

مترجم: فرحت عثمانی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 435، قیمت: 220 روپے

دنیا کی بہترین کہانیاں

انتخاب وترتیب: گنگا پرساد ول

مترجم: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

نظری تنقید: مسائل ومباحث

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد دوم)

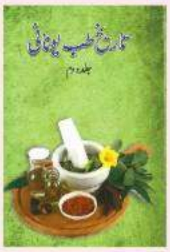

ادارہ

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

تشریح البدن (جلد سوم)

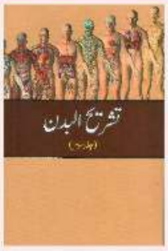

ادارہ

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 455

قیمت: 210 روپے

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 514

قیمت: 235 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, मार्च- २०२३ वर्ष:७, अंक: ३
Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2023, Vol. 7, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13- 03-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

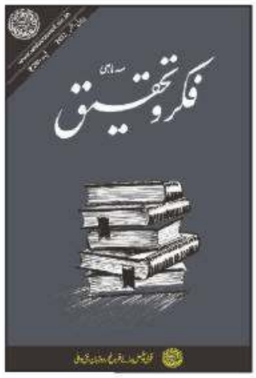

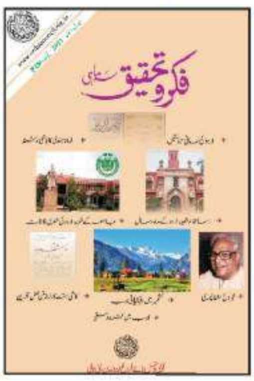

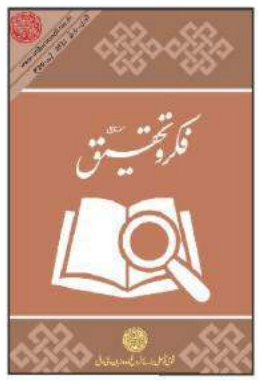

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6